Registered No. L. 4186

ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

جلد ۱۴ - عدد ۳

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور

ملتان روڈ

قیمت سالانہ پانچ روپے

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعد اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عنہ ۱۰	عشہ ۲۵	للعہ ۴۵	لتہ
نصف صفحہ	۶	عشہ ۱۵	عشہ ۲۵	للعہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ ۴	عنہ ۱۰	معشہ ۱۷	عشہ ۲۵

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ - مطابق ماہ مئی ۱۹۳۹ء - جلد ۱۴ - عدد ۳

باہتمام سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر، گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن

ملتان روڈ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں۔

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اُس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر اپنی کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی خواہش یہ ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اُن "کچھ اور" کا تعین کریں، اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوت فیصلہ اور قوت ارادی ہے۔ آپ کو بہر حال یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہش مند ہیں، اور اس فیصلہ کی رو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک پوزیشن سے محبت اور دوسری پوزیشن کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اس پوزیشن سے چمٹ جائے اور کبھی اُس پوزیشن کی طرف لپکے، مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلوّن اور تردّد کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتّہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اسے اڑائے اڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور اُن کی جماعتوں کے اعمال میں تلوّن اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدت سے نمایاں

ہیں اور اب نمایاں تر ہوگئی ہیں ان کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خودشناسی مفقود ہے اور کہیں قوت فیصلہ اور قوتِ ارادی۔ ایک معتدبہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا شعور ہی نہیں رکھتی۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیے؟ ایک دوسری جماعت، اور وہ بھی معتدبہ، ایسی ہے جو شعور ذات تو رکھتی ہے مگر قوت فیصلہ اور قوت ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس کے ہونے کے مقتضیات کیا ہیں، لیکن اس علم نے ان میں محبت اور خوف کے دوگونہ جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ انہیں اپنی ہستی سے محبت ہے۔ لیکن جو کچھ یہ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کی دہشت ان پر طاری ہوگئی ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اسکے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بہت بھاری بوجھ آتا ہے۔ اسکے ساتھ پابندیاں ہیں۔ ایثار اور قربانی ہے۔ جہاد اور مشقت ہے۔ ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف ان کے دل پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں، اور کوئی ایسی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انہیں خود بھی معلوم ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اسلیے انکی قوت فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان متردد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چمٹنا چاہتے ہیں مگر اسکے مقتضیات کا خوفناک چہرہ دیکھ کر دور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پورے کافر ہو کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کرو۔ یہ اسکے لیے بھی تیار نہیں لہٰذا اس سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ اب انکی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ہی ڈھونڈتا ہو، مگر کسی طرف کی بھی ذمہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اسیلیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں چل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ انکے مقاصد میں غلطی ہے۔ انکے طریق کار میں غلطی ہے۔ انکی قیادت میں غلطی ہے۔ اور انکی روح کیفیت میں غلطی ہے۔ بہتیرے لوگوں کو تو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اسیلیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ انکے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمانوں کا فائدہ ہے"۔ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ اور بہت سے لوگ جنکو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ ان کے نفس نے انہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کی درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو، انکے مقتضیات اور انکے نتائج کے ساتھ، کھول کر پیش کر دیا جائے، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔

پچھلی اشاعت میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اسی توضیح کے لیے چھیڑی گئی تھی۔ وہاں ہم نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے صرف یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس اجتماعی ہیئت کے لیے وضع کی گئی ہے، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ ہمیں، اور کسی شخص کو بھی، یہ حق نہیں کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کریں۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی الجھن اور نظر کے دھندکو دور کر دیں، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کر لیں اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کو جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ

اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے مہلک ہیں ۔

ایک جماعت میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جسے "قومیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ چند برتاؤ کے ڈھنگ اور چند مطبوع و نامطبوع چیزوں کے معیار ہوتے ہیں جو ان کی زندگی میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی ان کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو انکی کلچر کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کلچر، یعنی اسلاف کے اس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کے لیے چھوڑ جائیں تاکہ انکی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس طرح جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اسکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا کنٹرول اسکے اپنے ہاتھ میں ہو، اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلط نہ ہونے پائے۔ یہ اس قوم کا سیاسی مفاد ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اسکے پاس ہیں انکی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انہیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوشحال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اسکے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان صدیوں کی توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کے سیاسی اور معاشی مفاد، اور انکی کلچر کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جسکی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان

کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا انکی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسلٍ ایک طرح کی زندگی بسر کرکے اپنے اندر "قومیت" پیدا کرلی ہے؟ کیا وہ کلچر جسے یہ اسلامی کلچر کہتے ہیں، محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجارب کا مجموعہ ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انہوں نے باپ دادا سے پایا ہے اسکی حفاظت کریں، جن وسائل معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انہیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انہیں اپنے گروہ کے افراد کی خوشحالی کے لیے ضرورت ہے ان کو حاصل کریں، اور فی الجملہ ان کی اجتماعی زندگی کا کنٹرول ان کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی کلچر ہے، اور یہی ان کے قومی مسائل ہیں تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔

ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ انکی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوجائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظام معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر حرکت کریں۔ اور ان کی تمام جدوجہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس کے کہ اسلام، جس کے نام سے یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ ان کے لیے تمام تر اہمیت صرف اسی ایک چیز کی ہونی چاہیے کہ ملک کا نظم ونسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہرحال اس کے کنٹرول میں خود ان کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی کلچر) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں، اور جس قسم کے بھی فوائد و منافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتدبہ حصہ ان کے افراد کو بھی مل جائے۔

ان کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کرلیں بشرطیکہ اس معاملہ میں ان کے اپنے گروہ کا فائدہ مقصود ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوگا۔

جبکہ معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (نیشنلزم) پیدا ہوئی ہے اسی طرح ان میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور تمکن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ انکی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخاب طبیعی اور بقائے اصلح کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیے کی طرح صالح ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کر دیں۔ یہ بھی امپیریلیسٹ قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا لطف پیدا کریں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے۔ نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات و رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اسلیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء کے میدان میں اتریں اور انتخاب طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی کلچر ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے، کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور اس کلچر سے تبرّی کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے نہیں، آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کریں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی حیثیت پر اسی طرح دلالت کرنے لگیگا جسطرح اب لفظ "مسلمان" کرتا ہے۔ آخر اس نوع کی قومیت میں کونسی خصوصیت ہے جسکے لیے لفظ "مسلمان" ہی کا

استعمال ضروری ہو؟

اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اسی لیے نہیں ہے کہ آپکے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اصولاً اسلام کے خلاف ہیں۔ بلکہ اسکی ضرورت اسلیے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کرینگے وہ اسلام کے لیے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھیگی کہ اسلام یہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اس کو اسلام سے اور زیادہ دور پھینکے گی۔ آپ اپنے "قومی مفاد" کی حفاظت کے لیے انگریزی کی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کرینگے، اور دنیا یہ سمجھیگی کہ شائد یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کرینگے جو کسی مسلمان یا بحیثیت مسلمان قوم کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس دنائت کو اسلام کی طرف منسوب کریگی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کرینگے اسلیے کہ وہ آپکے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اُسی چیز کی مخالفت کرینگے اسلیے کہ وہ آپکے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملینگے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑینگے، نہ اسلیے کہ آپکے اور اس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اسلیے کہ آپ کے پیش نظر اصول نہیں "قومی مفاد" ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہو گی، دنیا سمجھیگی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی فائدے کی تلاش میں ہر طرف بھٹکیں گے، فاشزم کے اصول اور کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کرینگے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مستبدانہ شخصی حکومتوں کے دامن میں بھی پناہ لینگے، انگریز اور ہندو اور جس کسی کے آستانے پر بھی فائدے کا بت بیٹھا نظر آئیگا اسی کی طرف سجدہ ریز ہونگے، اور یہ سارے داغ آپکے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائینگے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو احسانات کیے ہیں ان کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس طرح اسکی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیے کہ اسلام یہودیت کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قوم بناتا ہو۔ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (ورلڈ تھیوری) اور کلّی نصب العین ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس مسلک، اس نظریہ، اس نصب العین کو لے کر اٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اسکو قبول کرتے جائیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اس کے نزدیک "اسلامی" صرف وہ چیز ہے جو اس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو، اور جو چیز اسکے خلاف ہو اس کو وہ اپنانے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جیتے ہیں، اور اس کو دنیا میں حکمراں بنانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو یقیناً آپ "اسلامی جماعت" اور "مسلمان قوم" ہیں۔ اور اگر آپ اپنے لیے جیتے اور اپنے مفاد کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو اسلام سے آپکا کوئی تعلق نہیں، آپکو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

عالمگیر مسلک یا جہانی نظریہ کے چند مقتضیات ہوتے ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اولاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی فطرت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مدارات اور مصالحت (کمپرومائز) کرنا اسکے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا بلکہ غالب ہونا چاہتا ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کلّی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اسکو انسان سے بحث ہوتی ہے، اور وہ ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطع نظر اسکے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے۔

ثالثاً اسکے پیشِ نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اسکے اصول کے خلاف قائم ہے اس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اسکی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور انکی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو دوسری قوموں کے لیے اس کا اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائیگا۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی کلچر اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالم انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق —— نظریات نہیں بلکہ حقائق —— دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، ان سب کو لیکر وہ اپنے تجویز کردہ نظام اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔

سادساً اسکی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کی فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا اقتضا کرتا ہے کہ اسکے اصولوں کو ایک جنگ آزما تحریک کی بنیاد بنایا جائے، اس پر ایمان رکھنے والے اس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اٹھیں، اور بالآخر اس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ اسلامی جماعت بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اس قومی پالیسی پر نظر ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اسے بالکلیہ بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑیگا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اسکے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرف نظر کر لینا ہوگا اور اپنی نظر اس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار رہنا پڑیگا اور کسی ایسی پارٹی سے جو آپکے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کر سکینگے۔ آپکو سختی کے ساتھ ایک با اصول جماعت بننا پڑیگا، ان ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپکے اصولوں کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے ان صالحین کو چن چن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپکو ابن الوقتی چھوڑ دینی پڑیگی۔ اپنے اصول سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کر سکینگے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی نقصان ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑیگا جو اپنے اصول کے لیے لڑنے والی ہو، جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" قائم کرنا نہ ہو، بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ بنینگے تو آپ کو اپنی قیادت میں بھی تغیر کرنا ہوگا۔ اس وقت آپکے قائد صرف وہ لوگ ہو سکینگے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں اور سب سے زیادہ ان کا اتباع کرنے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگوں کو صف اول میں جگہ مل سکتی ہے، مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پیچھے کی صفوں میں ہوگا بلکہ شاید ان میں سے بہتوں کو کسی صف میں بھی جگہ نہ ملیگی۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ آپ کے سامنے دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ انتخاب و اختیار میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہوگی، اور آپکے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہونگی۔ آپ کا

اور ان کا مقابلہ اُسی طرح ہو گا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے - ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزاء لے کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی - نہ ایک چٹان دوسری چٹان کے حیّز میں گھس سکتی ہے - ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں - یا تو ہر ایک چٹان اپنے اپنے حیّز میں رہنے پر قانع ہو - یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے - پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں - اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے ، مگر اُسی طرح کی وسعت جیسی فاشست اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے ، اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے - اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں ایک اور مفسد قوم کا اضافہ کرینگے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائیگی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائیگی -

بخلاف اسکے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی جماعت ہوں جو ایک مسلک اور ایک جہانی نظریہ کیلیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہونگے بلکہ ایک نامی جسم کی طرح ہونگے - آپکی مثال اس درخت کی سی ہوگی جو ہر طرف اپنے گردوپیش سے اجزاء جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے - اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت (ورلڈ فورس) ہونگے - آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے فتح کرنیکی کوشش کرینگے اور اگر واقعی آپکے اصول فطرت انسانی کو اپیل کرنیوالے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں ___ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں ___ تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپکے سامنے پیش کردیگی - آپکی ذات اور آپکے ذاتی مفاد میں کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے ، دنیا انکی طرف کھنچے گی نہیں بلکہ آپکو زبردستی کھینچنا پڑیگا لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے ، دنیا انکی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جئیں اور مریں - آپکے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے - وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اسلیے بنتی چلی جارہی ہے کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے ہیں - آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد چھوڑ دیں اور انہیں صرف اشتراکیوں کے مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھینگے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائیگی -

---

شاید یہاں آپ یہ شبہ پیش کرینگے کہ صاحب اسلام کے خلاف تو ہر طرف سخت تعصبات پھیلے ہوئے ہیں ، بھلا اب

وسیع پیمانے پر لوگوں کو مسلمان بنانا کہاں ممکن ہے؟ اور یہ کہ اسلام اگر محض ایک معاشی پروگرام ہوتا یا اجتماعی مسلک ہوتا تو اشتراکیت کی طرح وہ پھیل سکتا تھا، مگر وہ سب سے پہلے ایک اعتقادی نظام ہے، اور اس میں شریک ہونے کے لیے تو اس کے عقائد کو ماننا ضروری ہے لہٰذا اسلام کی توسیع میں بہت زیادہ مشکلات ہیں۔

یہ شبہ بہت لوگوں کے دلوں میں ہے، اور بارہا میرے سامنے پیش کیا گیا ہے، مگر میں اسکو کوئی وزن نہیں دیتا۔ دنیا کا کوئی اجتماعی مسلک ایسا نہیں ہے جو اپنے کچھ عقائد نہ رکھتا ہو، اور کچھ مابعد الطبیعی یا فلسفیانہ تصورات پر ایمان لانے کی دعوت نہ دیتا ہو۔ ہر مسلک کچھ بنیادی حقیقتیں پیش کرتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ ان حقیقتوں پر پختہ اعتقاد رکھا جائے۔ اعتقاد کے بغیر کسی مسلک میں جان ہی نہیں پڑ سکتی۔ لہٰذا ایک اعتقادی نظام ہونا اسلام کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر اس جہت سے اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل تھی تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے، پھر اس سے ڈرنے کی آخر کیا وجہ؟ حقیقت یہ ہے کہ مشکلات قرآنی اور محمدی اسلام کی راہ میں مزاحم نہیں ہیں، بلکہ مولویانہ اسلام اور اس اسلام کی راہ میں مزاحم ہیں جس کا نمونہ ہمارے رئیس اور امراء اور سیاسی لیڈر اور جھوٹی مذہبیت کا لبادہ پہننے والے دنیا پرست لوگ پیش کرتے ہیں۔ جب کسی اعتقاد کا رشتہ عملی زندگی سے توڑ دیا جائے، اور جب مذہبی عبادات کا کوئی رابطہ اجتماعی نظام سے باقی نہ رہنے دیا جائے، اور جب کلیات اور اصول کو پس پشت ڈال کر ظاہری شکلوں کی ناپ تول اور چھوٹے چھوٹے جزئیات کی نگہداشت پر دین کا مدار رکھ دیا جائے تو غیروں کا اسلام کی طرف آنا تو درکنار، خود مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔ اس جہت سے بلاشبہ اسلام کی راہ میں سخت مشکلات حائل ہیں، مگر ان مشکلات کا علاج یہ نہیں ہے کہ اسلام ہی سے ہاتھ دھو لیا جائے، بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اسلام کے عقائد اور اس کی عبادات کا رابطہ اس کے اجتماعی اصول و ضوابط سے از سر نو قائم کیا جائے اور ان اصولوں کی بنیاد پر ایک ایسی جنگ آزما تحریک اٹھائی جائے جس کے زور سے اسلام کے معتقد ایک مجاہد جماعت بن جائیں، اور بالآخر یہی اصول ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون کی حیثیت اختیار کر لیں۔

آگے چل کر انہی صفحات میں ہم بتلائیں گے کہ اسلام اپنے عقائد کی بنیاد پر کس طرح ایک اجتماعی نظام مرتب کرتا ہے اور اس اجتماعی نظام کے اصول کس طریقہ سے ایک زندہ تحریک، ایک عالمگیر کشش رکھنے والے عملی پروگرام کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

مقالات

جہاد فی سبیل اللہ

[یہ خطبہ اس جلسہ میں پڑھا گیا تھا جو ۲۲ صفر ۵۸ھ (۱۳ اپریل ۳۹ء) کو یوم اقبال کے سلسلہ میں ہز ہائی نس نواب صاحب بہاولپور کے زیر صدارت منعقد ہوا۔]

عموماً لفظ "جہاد" کا ترجمہ انگریزی زبان میں (Holy war) "مقدس جنگ" کیا جاتا ہے اور اس کی تشریح و تفسیر مدتہائے دراز سے کچھ اس انداز میں کی جاتی رہی ہے کہ اب یہ لفظ "جوش جنوں" کا ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سنتے ہی آدمی کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ مذہبی دیوانوں کا ایک گروہ ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے، داڑھیاں چڑھائے، خونخوار آنکھوں کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوا چلا آ رہا ہے، جہاں کسی کافر کو پاتا ہے پکڑ لیتا ہے اور تلوار اس کی گردن پر رکھ کر کہتا ہے کہ بول لا الٰہ الا اللہ، ورنہ ابھی سر تن سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ ماہرین نے ہماری یہ تصویر بڑی قلمکاریوں کے ساتھ بنائی ہے اور اس کے نیچے موٹے حرفوں میں لکھ دیا ہے کہ

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لطف یہ ہے کہ اس تصویر کے بنانے والے ہمارے وہ مہربان ہیں جو خود کئی صدیوں سے انتہا درجہ کی غیر مقدس جنگ (unholy war) میں مشغول ہیں۔ ان کی اپنی تصویر یہ ہے کہ دولت اور اقتدار کے بھوکے ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر قزاقوں کی طرح ساری دنیا پر پل پڑے ہیں اور ہر طرف تجارت کی منڈیاں، خام پیداوار کے ذخیرے، نوآبادیاں بسانے کے قابل زمینیں اور معدنیات کی کانیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں تاکہ اپنی حرص کی کبھی نہ بجھنے والی آگ کے لیے ایندھن فراہم کریں۔ ان کی جنگ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ پیٹ کی راہ میں ہے، ہوس اور نفس امارہ کی راہ

ہیں ہے - ان کے نزدیک کسی قوم پر حملہ کرنے کے لیے بس یہ کافی وجہ جواز ہے کہ اسکی زمین میں کانیں ہیں، یا اجناس کافی پیدا ہوتی ہیں، یا ان کے کارخانوں کا مال وہاں اچھی طرح کھپایا جاسکتا ہے، یا اپنی نائد آبادی کو وہاں آسانی کے ساتھ بسایا جاسکتا ہے، یا اور کچھ نہیں تو اس قوم کا یہ گناہ بھی کوئی معمولی گناہ نہیں کہ وہ کسی ایسے ملک کے راستہ میں رہتی ہے جس پر یہ پہلے قبضہ کرچکے ہیں یا اب قبضہ کرنا چاہتے ہیں - ہم نے جو کچھ کہا وہ زمانۂ ماضی کا قصہ ہے، اور ان کے کارنامے حال کے واقعات ہیں جو شب و روز دنیا کی آنکھوں کے سامنے گذر رہے ہیں - ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ، غرض کرۂ زمین کا کونسا حصہ ایسا بچارہ گیا ہے جو ان کی اس غیر مقدس جنگ سے لالہ زار نہیں ہوچکا؟ مگر انکی مہارت قابلِ داد ہے - انھوں نے ہماری تصویر اتنی بھیانک اور اتنی بڑی بنائی کہ خود ان کی تصویر اس کے پیچھے چھپ گئی، اور ہماری سادہ لوحی بھی قابلِ داد ہے۔ جب ہم نے غیروں کی بنائی ہوئی اپنی یہ تصویر دیکھی تو ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ ہمیں اس تصویر کے پیچھے جھانک کر خود مصوروں کی صورت دیکھنے کا ہوش ہی نہ آیا اور لگے معذرت کرنے کہ حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کو کیا جانیں - ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پرامن مبلغ لوگ ہیں - چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرالینا، بس یہ ہمارا کام ہے - ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور کبھی کبھار ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا تو ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھادیا - سو اب تو ہم اس سے بھی توبہ کرچکے ہیں - حضور کی طمانیت کے لیے تلوار والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کردیا گیا ہے - اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام ہے - توپ اور بندوق چلانا سرکار کا کام ہے اور زبان اور قلم چلانا ہمارا کام!

جہاد کے متعلق غلط فہمی کے اسباب | خیر یہ تو سیاسی چالوں کی بات ہے - مگر خالص علمی حیثیت سے جب ہم ان اسباب کا تجزیہ کرتے ہیں جنکی وجہ سے "جہاد فی سبیل اللہ" کی حقیقت کو سمجھنا غیر مسلموں اور خود مسلمانوں کے لیے دشوار ہوگیا ہے تو ہمیں دو بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کا سراغ ملتا ہے:

پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام کو ان معنوں میں محض ایک مذہب سمجھ لیا گیا ہے جن میں لفظ مذہب عموماً بولا جاتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان معنوں میں محض ایک قوم سمجھ لیا گیا ہے جن میں یہ لفظ عموماً مستعمل ہوتا ہے۔

ان دو غلط فہمیوں نے صرف ایک جہاد ہی کے مسئلہ کو نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے پورے اسلام کے نقشہ کو بدل ڈالا ہے۔ اور مسلمانوں کی پوزیشن کلی طور پر غلط کر کے رکھ دی ہے۔

"مذہب" کے معنی عام اصطلاح کے اعتبار سے بجز اسکے اور کیا ہیں کہ وہ چند عقائد اور چند عبادات اور مراسم کا مجموعہ ہوتا ہے؟ اس معنی کے لحاظ سے مذہب کو واقعی ایک پرائیویٹ معاملہ ہی ہونا چاہیے۔ آپ کو اختیار ہے کہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں، اور آپ کا ضمیر جس کی عبادت کرنے پر راضی ہو اسکو جس طرح چاہیں پکاریں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی جوش اور سرگرمی آپ کے اندر اس مذہب کے لیے موجود ہے تو آپ دنیا بھر میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھریے اور دوسرے عقائد والوں سے مناظرے کیجیے۔ اس کے لیے تلوار ہاتھ میں پکڑنے کا کونسا موقع ہے؟ کیا آپ لوگوں کو مار مار کر اپنا ہم عقیدہ بنانا چاہتے ہیں؟ یہ سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے جبکہ آپ اسلام کو عام اصطلاح کی رو سے ایک "مذہب" قرار دے لیں، اور یہ پوزیشن اگر واقعی اسلام کی ہو تو جہاد کے لیے حقیقت میں کوئی وجہ جواز ثابت نہیں کی جاسکتی۔

اسی طرح "قوم" کے معنی اسکے سوا کیا ہیں کہ وہ ایک متجانس گروہِ اشخاص (Homogenous group) کا نام ہے جو چند بنیادی امور میں مشترک ہونے کی وجہ سے باہم مجتمع اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو گیا ہو۔ اس معنی میں جو گروہ ایک قوم ہو وہ دو ہی وجوہ سے تلوار اٹھاتا ہے اور اٹھا سکتا ہے۔ یا تو اس کے جائز حقوق چھیننے کے لیے کوئی اس پر حملہ کرے، یا وہ خود دوسروں کے جائز حقوق چھیننے کے لیے حملہ آور ہو۔ پہلی صورت میں تو خیر تلوار اٹھانے کے لیے کچھ نہ کچھ اخلاقی جواز موجود بھی ہے (اگرچہ بعض دھرماتماؤں کے نزدیک یہ بھی ناجائز ہے) لیکن دوسری صورت کو تو بعض ڈکٹیٹروں کے سوا کوئی بھی جائز نہیں کہہ سکتا، حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس جیسی وسیع سلطنتوں کے مدبرین بھی اس کو جائز کہنے کی جرأت نہیں رکھتے۔

جہاد کی حقیقت پس اگر اسلام ایک "مذہب" ہے اور مسلمان ایک "قوم"، تو جہاد کی ساری معنویت جسکی بنا پر اُسے افضل العبادات کہا گیا ہے، سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کسی "مذہب" کا اور مسلمان کسی "قوم" کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے جو تمام دنیا کے اجتماعی نظم Social structure

کو بدل کر اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور مسلمان اُس بین الاقوامی انقلابی جماعت International revolutionary party) کا نام ہے جسے اسلام اپنے مطلوبہ انقلابی پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے منظم کرتا ہے، اور جہاد اُس انقلابی جدوجہد (Revolutionary struggle) کا، اُس انتہائی صَرفِ طاقت کا نام ہے جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے عمل میں لائی جائے۔

تمام انقلابی مسلکوں کی طرح اسلام بھی عام مروّج الفاظ کو چھوڑ کر اپنی ایک خاص اصطلاحی زبان (Terminology) اختیار کرتا ہے تاکہ اسکے انقلابی تصورات عام تصورات سے ممتاز ہو سکیں۔ لفظ جہاد بھی اسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے حرب اور اسی نوعیت کے دوسرے عربی الفاظ جو جنگ (War) کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں، قصداً ترک کر دیے اور انکی جگہ "جہاد" کا لفظ استعمال کیا جو (struggle) کا ہم معنی ہے بلکہ اس سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے۔ انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

To exert one's utmost endeavours in promoting a cause

"اپنی تمام طاقتیں کسی مقصد کی تحصیل میں صرف کر دینا"

سوال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو چھوڑ کر یہ نیا لفظ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس کا جواب بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ "جنگ" کا لفظ قوموں اور سلطنتوں کی اُن لڑائیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے جو اشخاص یا جماعتوں کی نفسانی اغراض کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان لڑائیوں کے مقاصد محض ایسے شخصی یا اجتماعی مقاصد ہوتے ہیں جن کے اندر کسی نظریہ اور کسی اصول کی حمایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسلام کی لڑائی چونکہ اس نوعیت کی نہیں ہے، اسلیے وہ سرے سے اس لفظ ہی کو ترک دیتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایک قوم کا مفاد یا دوسری قوم کا نقصان نہیں ہے۔ وہ اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ زمین پر ایک سلطنت کا قبضہ رہے یا دوسری سلطنت کا۔ اس کو دلچسپی جس چیز سے ہے وہ محض انسانیت کی فلاح ہے۔ اس فلاح کے لیے وہ اپنا ایک خاص نظریہ اور ایک عملی مسلک رکھتا ہے۔ اس نظریہ اور مسلک کے خلاف جہاں جس کی حکومت بھی ہے اسلام اسے مٹانا چاہتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ کوئی قوم ہو اور کوئی ملک ہو۔ اُس کا مدعا اپنے نظریہ اور مسلک کی حکومت

قائم کرنا ہے بلا اس لحاظ کے کہ کون اس کا جھنڈا لے کر اٹھتا ہے اور کس کی حکمرانی پر اسکی ضرب پڑتی ہے۔ وہ زمین مانگتا ہے ــــ زمین کا ایک حصہ نہیں بلکہ پورا کرۂ زمین ــــ اس لیے نہیں کہ ایک قوم یا بہت سی قوموں کے ہاتھ سے نکل کر اسکی حکومت کسی خاص قوم کے ہاتھ میں آ جائے، بلکہ صرف اس لیے کہ انسانیت کی فلاح کا جو نظریہ اور پروگرام اس کے پاس ہے اس سے تمام نوع انسانی متمتع ہو۔ اس غرض کے لیے وہ تمام ان طاقتوں سے کام لینا چاہتا ہے جو انقلاب برپا کرنے کے لیے کارگر ہو سکتی ہیں، اور ان سب طاقتوں کے استعمال کا ایک جامع نام "جہاد" رکھتا ہے۔ زبان و قلم کے زور سے لوگوں کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور ان کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرنا بھی جہاد ہے۔ تلوار کے زور سے پرانے ظالمانہ نظام زندگی کو بدل دینا اور نیا عادلانہ نظام مرتب کرنا بھی جہاد ہے۔ اور اس راہ میں مال صرف کرنا اور جسم سے دوڑ دھوپ کرنا بھی جہاد ہے۔

"فی سبیل اللہ" کی لازمی قید لیکن اسلام کا جہاد نرا "جہاد" نہیں ہے بلکہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے، اور "فی سبیل اللہ" کی قید اسکے ساتھ ایک لازمی قید ہے۔ یہ "فی سبیل اللہ" کا لفظ بھی اسلام کی اُسی مخصوص اصطلاحی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کی طرف ابھی میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے "راہِ خدا میں"۔ اس ترجمہ سے لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ زبردستی لوگوں کو اسلام کے مذہبی عقائد کا پیرو بنانا جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ لوگوں کے تنگ دماغوں میں "راہِ خدا" کا کوئی مفہوم اسکے سوا نہیں سما سکتا۔ مگر اسلام کی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ ہر وہ کام جو اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے کیا جائے اور جس کے کرنے والے کی نیت اُس سے خود کوئی دنیوی فائدہ اٹھانا نہ ہو، بلکہ محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو، اسلام ایسے کام کو "فی سبیل اللہ" قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ خیرات دیتے ہیں اس نیت سے کہ اسی دنیا میں مادّی یا اخلاقی طور پر اس خیرات کا کوئی فائدہ آپ کی طرف پلٹ کر آئے تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ اور اگر خیرات سے آپ کی نیت یہ ہے کہ ایک غریب انسان کی مدد کر کے آپ خدا کی خوشنودی حاصل کریں تو یہ فی سبیل اللہ ہے۔ پس یہ اصطلاح مخصوص ہے ایسے کاموں کے لیے جو کامل خلوص کے ساتھ، ہر قسم کی نفسانی اغراض سے پاک ہو کر، اس نظریہ پر کیے جائیں کہ انسان کا دوسرے انسانوں کی فلاح کے لیے کام کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے، اور انسان کی زندگی کا

نصب العین مالک کائنات کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

"جہاد" کے لیے بھی "فی سبیل اللہ" کی قید اسی غرض کے لیے لگائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جب نظامِ حکومت میں انقلاب برپا کرنے، اور اسلامی نظریہ کے مطابق نیا نظام مرتب کرنے کے لیے جدوجہد کرنے اٹھے، تو اس قیام، اور اس سربازی و جاں نثاری میں اسکی اپنی کوئی نفسانی غرض نہ ہونی چاہیے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ قیصر کو ہٹا کر خود قیصر بن جائے۔ اپنی ذات کے لیے مال و دولت، یا شہرت و ناموری، یا عزت و جاہ حاصل کرنے کا شائبہ تک اسکی جدوجہد کے مقاصد میں نہ ہونا چاہیے۔ اسکی تمام قربانیوں اور ساری محنتوں کا مدعا صرف یہ ہونا چاہیے کہ بندگانِ خدا کے درمیان ایک عادلانہ نظامِ زندگی قائم کیا جائے، اور اس کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا اور کچھ مطلوب نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (نساء - ۱۰)

"ایمان دار لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں"

"طاغوت" کا مصدر طغیان ہے جس کے معنی حد سے گذر جانے کے ہیں۔ دریا جب اپنی حد سے گذر جاتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ طغیانی آگئی ہے۔ اسی طرح جب آدمی اپنی جائز حد سے گذر کر اس غرض کے لیے اپنی طاقت استعمال کرتا ہے کہ انسانوں کا خدا بن جائے یا اپنے مناسب حصہ سے زیادہ فوائد حاصل کرے تو یہ طاغوت کی راہ میں لڑنا ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں راہ خدا کی جنگ وہ ہے جس کا مقصد صرف یہ ہو کہ خدا کا قانونِ عدل دنیا میں قائم ہو، لڑنے والا خود بھی اسکی پابندی کرے اور دوسروں سے بھی اسکی پابندی کرائے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ (القصص - ۹)	آخرت میں عزت کا مقام ہم نے ان لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی قائم کرنا اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ اور عاقبت کی کامیابی ایسے ہی پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "راہِ خدا کی جنگ سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص مال کے لیے جنگ کرتا ہے۔ دوسرا شخص بہادری کی شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے۔ تیسرے شخص کو کسی سے عداوت ہوتی ہے یا قومی حمیت کا جوش ہوتا ہے اسلیے جنگ کرتا ہے۔ ان میں سے کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟" آنحضرت نے جواب دیا کسی کی بھی نہیں۔ فی سبیل اللہ تو صرف اُس شخص کی جنگ ہے جو خدا کا بول بالا کرنے کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتا"۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ "اگر کسی شخص نے جنگ کی اور اس کے دل میں اونٹ باندھنے کی ایک رسی حاصل کرنے کی بھی نیت ہوئی تو اس کا اجر ضائع ہو گیا"۔ اللہ صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو محض اسکی خوشنودی کے لیے ہو اور کوئی شخصی یا اجتماعی غرض نہ ہو۔ پس جہاد کے لیے فی سبیل اللہ کی قید اسلامی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مجرد جہاد تو دنیا میں سب ہی جان وار کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مقصد کی تحصیل کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہا ہے۔ لیکن "مسلمان" جس انقلابی جماعت کا نام ہے اسکے انقلابی نظریات میں سے ایک اہم ترین نظریہ بلکہ بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اپنی جان، مال کھپاؤ، دنیا کی ساری سرکش طاقتوں سے لڑو، اپنے جسم و روح کی ساری طاقتیں خرچ کردو نہ اسلیے کہ دوسرے سرکشوں کو ہٹا کر تم انکی جگہ لے لو، بلکہ صرف اسلیے کہ دنیا سے سرکشی و طغیان مٹ جائے اور خدا کا قانون دنیا میں نافذ ہو۔

جہاد کے اس مفہوم اور فی سبیل اللہ کی معنویت کو مختصراً بیان کر دینے کے بعد میں اُس دعوتِ انقلاب کی تھوڑی سی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے تاکہ آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جا سکے کہ اس دعوت کے لیے جہاد کی حاجت کیا ہے اور اس کی غایت (Objective) کیا ہے۔

اسلام کی دعوت انقلاب اسلام کی دعوت انقلاب کا خلاصہ یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ۔ "اے انسانو! صرف اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے"۔

اسلام مزدوروں یا زمینداروں یا کاشتکاروں یا کارخانہ داروں کو نہیں پکارتا بلکہ تمام انسانوں کو پکارتا ہے۔ اس کا خطاب انسان سے بحیثیت انسان ہے۔ اور وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم خدا کے سوا کسی کی بندگی، اطاعت، فرماں برداری

کرتے ہو تو اسے چھوڑ دو، اور اگر خود تمہارے اندر خدائی کا داعیہ ہے تو اسے بھی نکال دو کر دو سروں سے اپنی بندگی کرانے اور دوسروں کا سر اپنے آگے جھکوانے کا حق بھی تم میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تم سب کو ایک خدا کی بندگی قبول کرنی چاہیے اور اس بندگی میں سب کو ایک سطح پر آجانا چاہیے۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران - ۷)

آؤ، ہم اور تم ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اور خداوندی میں کسی کو خدا کا شریک بھی نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے بجائے امر و نہی کا مالک بھی نہ بنائے۔

یہ عالمگیر اور کلی انقلاب کی دعوت تھی۔ اس نے پکار کر کہا کہ ان الحکم الا للّٰہ "حکومت سوائے خدا کے اور کسی کی نہیں ہے"۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذات خود انسانوں کا حکمراں بن جائے اور اپنے اختیار سے جس چیز کا چاہے حکم دے اور جس چیز سے چاہے روک دے۔ کسی انسان کو بالذات امر و نہی کا مالک سمجھنا در اصل خدائی میں اسے شریک کرنا ہے اور یہی بنائے فساد ہے۔ اللہ نے انسان کو جس صحیح فطرت پر پیدا کیا ہے، اور زندگی بسر کرنے کا جو سیدھا راستہ بتایا ہے اس سے انسان کے ہٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ خدا کو بھول جائیں اور نتیجۃً خود اپنی حقیقت کو بھی فراموش کر دیں۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف بعض اشخاص یا خاندان یا طبقے خدائی کا کھلا یا چھپا داعیہ لیکر اٹھتے ہیں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں، اور دوسری طرف اسی خدا فراموشی و خود فراموشی کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کا ایک حصہ ان طاقت وروں کی خداوندی مان لیتا ہے اور ان کے اس حق کو تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ حکم کریں اور وہ اس حکم کے آگے سر جھکا دیں۔ یہی دنیا میں ظلم، فساد اور ناجائز انتفاع (Exploitation) کی بنیاد ہے، اور اسلام پہلی ضرب اسی پر لگاتا ہے۔ وہ ہانکے پکارے کہتا ہے:

لَا تُطِیْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ

ان لوگوں کا حکم ہرگز نہ مانو جو اپنی حد جائز سے گذر

اَلَّذِیْنَ هُمْ یُفْسِدُوْنَ وَلَا یُصْلِحُوْنَ (الشعراء - ۸)
گئے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف - ۴)
اس شخص کی اطاعت ہرگز نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات نفس کا بندہ بن گیا ہے اور جس کی حکومت افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (ہود - ۲)
خدا کی لعنت ہو ان ظالموں پر جو خدا کے بتائے ہوئے زندگی کے سیدھے راستے میں کاوٹیں ڈالتے ہیں اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ؟ یہ بہت سے چھوٹے بڑے خدا جن کی بندگی میں تم پھنسے جا رہے ہو انکی بندگی قبول ہے، یا اُس ایک خدا کی جو سب سے زبردست ہے؟ اگر اس خدائے واحد کی بندگی قبول نہ کرو گے تو ان چھوٹے اور جھوٹے خداؤں کی آقائی سے تمہیں کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ یہ کسی نہ کسی طور سے تم پر تسلط پائینگے، اور فساد برپا کرکے رہینگے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ (والصفت - ۳)
یہ بادشاہ جب کسی بستی میں گھستے ہیں تو اس کے نظام حیات کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا یہی وتیرہ ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ - ۲۵)
اور جب ایسا انسان حکومت پالیتا ہے تو زمین میں فساد پھیلاتا ہے کھیتیوں کو خراب اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

یہاں پوری تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوتِ توحید و

خدا پرستی محض اُس معنی میں ایک مذہبی عقیدہ کی دعوت نہ تھی جس میں اور دوسرے مذہبی عقائد کی دعوت ہوا کرتی ہے، بلکہ یہ حقیقتہً ایک اجتماعی انقلاب (Social revolution) کی دعوت تھی۔ اسکی ضرب بلا واسطہ ان طبقوں پر پڑتی تھی جنھوں نے مذہبی رنگ میں پروہت بنکر، یا سیاسی رنگ میں بادشاہ اور رئیس و حکمراں گروہ بن کر، یا معاشی رنگ میں مہاجن اور زمیندار اور اجارہ دار بن کر عامۃ الناس کو اپنا بندہ بنا لیا تھا۔ یہ کہیں علانیہ اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنے ہوئے تھے، دنیا سے اپنے پیدائشی یا طبقاتی حقوق کی بنا پر اطاعت و بندگی کا مطالبہ کرتے تھے اور صاف کہتے تھے کہ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ، اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی، اور اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ اور مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً اور کسی جگہ انہوں نے عامۃ الناس کی جہالت کو استعمال (Exploit) کرنے کے لیے مصنوعی خداؤں اور ہیکلوں کی شکل میں بنا رکھے تھے جن کی آڑ پکڑ کر یہ اپنے خداوندی حقوق بندگانِ خدا سے تسلیم کراتے تھے۔ پس کفر و شرک اور بت پرستی کے خلاف اسلام کی دعوت، اور خدائے واحد کی بندگی و معبودیت کے لیے اسلام کی تبلیغ براہ راست حکومت اور اس کو سہارا دینے والے یا اس کے سہارے چلنے والے طبقوں کی اغراض سے متصادم ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جب کبھی کسی نبی نے یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ کی صدا بلند کی، حکومت وقت فوراً اسکے مقابلے میں آن کھڑی ہوئی، اور تمام ناجائز انتفاع کرنے والے طبقے اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے، کیونکہ یہ محض ایک مابعد الطبیعی قضیہ Metaphysical proposition کا بیان نہ تھا، بلکہ ایک اجتماعی انقلاب کا اعلان تھا، اور اس میں پہلی آواز سنتے ہی سیاسی شورش کی بو سونگھ لی جاتی تھی۔

اسلامی دعوت انقلاب کی خصوصیت اس میں شک نہیں انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی لیڈر تھے، اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے انقلابی لیڈر ہیں۔ لیکن جو چیز دنیا کے عام انقلابیوں اور ان خدا پرست انقلابی لیڈروں کے درمیان واضح خط امتیاز کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسرے انقلابی لوگ، خواہ وہ کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں عدل و توسط کے صحیح مقام کو نہیں پا سکتے۔ وہ یا تو خود مظلوم طبقوں میں سے اٹھتے ہیں، یا انکی حمایت کا جذبہ لے کر اٹھتے ہیں، اور پھر سارے معاملات کو انہی طبقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکی نظر غیر جانبدارانہ اور خالص انسانیت کی نظر نہیں ہوتی بلکہ ایک طبقہ کی طرف غصہ و نفرت کا اور دوسرے طبقہ کی طرف حمایت کا جذبہ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ ظلم

کا ایسا علاج سوچتے ہیں جو نتیجۃً ایک جوابی ظلم ہوتا ہے - انکے لیے انتقام، حسد، اور عداوت کے جذبات سے پاک ہو کر ایک معتدل اور متوازن اجتماعی نظام تجویز کرنا ممکن نہیں ہوتا جس میں مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح ہو - بخلاف اسکے انبیاء علیہم السلام خواہ کتنے ہی ستائے گئے ہوں اور کتنا ہی ان پر اور ان کے ساتھیوں پر ظلم کیا گیا ہو، انکی انقلابی تحریک میں کبھی ان کے شخصی جذبات کا اثر آنے نہیں پایا - وہ براہ راست خدا کی ہدایت کے تحت کام کرتے تھے، اور خدا چونکہ انسانی جذبات سے منزہ ہے، کسی انسانی طبقہ سے اس کا مخصوص رشتہ نہیں، نہ کسی دوسرے انسانی طبقہ سے اسکو کوئی شکایت یا عداوت ہے، اس لیے خدا کی ہدایت کے تحت انبیاء علیہم السلام تمام معاملات کو خالص انسانیت ہی کی نظر سے دیکھتے تھے - وہ یہ دیکھتے تھے کہ تمام انسانوں کی مجموعی فلاح و بہبود اور خود ان ظالم طبقوں کی بھی حقیقی فلاح و بہبود کس چیز میں ہے، اور کس طرح ایک ایسا نظام اجتماعی بنایا جائے کہ ہر شخص اپنی جائز حدود میں رہ سکے، اپنے جائز حقوق سے متمتع ہو سکے، اور افراد کے باہمی روابط، نیز فرد اور جماعت کے باہمی تعلق میں کامل توازن قائم ہو سکے - یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی تحریک کبھی طبقاتی نزاع (Class war) میں تبدیل نہ ہونے پائی - انہوں نے اجتماعی تعمیر نو (social reconstruction) اس طرز پر نہیں کی کہ ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر مسلط کردیں بلکہ اس کے لیے عدل کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس میں تمام انسانوں کے لیے ترقی اور مادی و روحانی سعادت کے یکساں امکانات رکھے گئے تھے -

جہاد کی ضرورت اور اسکی غایت

اس مختصر مقالہ میں میرے لیے اُس اجتماعی نظام (social system) کی تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے - اگر کبھی موقع ملا تو میں اس کا ایک خاکہ پیش کرونگا یہاں اپنے موضوع کی حد میں رہتے ہوئے جس بات کو مجھے واضح کرنا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اسلام محض ایک مذہبی عقیدہ اور چند عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک جامع سسٹم ہے جو دنیا سے زندگی کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹانا چاہتا ہے، اور انکی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے جس کو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سب سے بہتر سمجھتا ہے -

اس تخریب و تعمیر اور انقلاب و اصلاح کے لیے وہ کسی ایک قوم یا گروہ کو نہیں بلکہ تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے - وہ خود ان ظالم طبقوں، ان ناجائز انتفاع کرنے والے گروہوں، حتیٰ کہ بادشاہوں اور رئیسوں کو بھی پکارتا ہے کہ آؤ اس جائز

حد کے اندر رہنا قبول کر لو جو تمہارے خالق نے تمہارے لیے مقرر کی ہے۔ اگر تم عدل اور حق کے نظام کو قبول کر لو گے تو تمہارے لیے امن اور سلامتی ہے۔ یہاں کسی انسان سے دشمنی نہیں ہے بلکہ دشمنی جو کچھ بھی ہے ظلم سے ہے، فساد سے ہے، بد اخلاقی سے ہے، اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنی فطری حد سے تجاوز کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہے جو فطرۃً اللہ کے لحاظ سے اس کا نہیں ہے۔

یہ دعوت جو لوگ بھی قبول کریں وہ خواہ کسی طبقہ، کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک کے ہوں، یکساں حقوق اور مساویانہ حیثیت سے اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں، اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے جسے قرآن حزب اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

یہ پارٹی وجود میں آتے ہی اپنے مقصدِ وجود کی تحصیل کے لیے جہاد شروع کر دیتی ہے۔ اس کے عینِ وجود کا اقتضاء یہی ہے کہ یہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی کو مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے مقابلہ میں تمدن و اجتماع کے اس معتدل و متوازن ضابطہ
کی حکومت قائم کرے جسے قرآن ایک جامع لفظ "کلمۃ اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر یہ پارٹی نظامِ حکومت کو بدلنے اور اسلامی نظامِ (۴)
حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ کسی اور مقصد کے لیے بنائی ہی نہیں گئی ہے، اور اس جہاد کے سوا اسکی ہستی کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔ قرآن اسکی پیدائش کا ایک ہی مقصد بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے:-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین (Preachers) اور مبشرین (Missionaries) کی جماعت نہیں ہے، بلکہ یہ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے (لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور مٹا دے، أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ کی خداوندی کو ختم کر دے

اور بدی کی جگہ نیکی قائم کرے۔ قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔[1] اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔[2] هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔[3] ——— لہٰذا اس پارٹی کے لیے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، کیونکہ مفسدانہ نظام تمدن ایک فاسد نظام حکومت کے بل پر ہی قائم ہوتا ہے، اور ایک صالح نظام تمدن اس وقت تک کسی طرح قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکومت مفسدین سے مسلوب ہو کر مصلحین کے ہاتھ میں نہ آجائے۔

دنیا کی اصلاح سے قطع نظر، اس کے لیے خود اپنے مسلک پر عامل ہونا بھی غیر ممکن ہے اگر حکومت کا نظام کسی دوسرے مسلک پر قائم ہو۔ کوئی پارٹی جو کسی سسٹم کو برحق سمجھتی ہو، کسی دوسرے سسٹم کی حکومت میں اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ایک اشتراکی مسلک کا آدمی اگر انگلستان یا جرمنی میں رہ کر اشتراکیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہے تو کسی طرح اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ سرمایہ داری اور نازیت کا ضابطۂ حیات حکومت کی طاقت سے بجبر اس پر مسلط ہوگا اور وہ اس کی قہرمانی سے کسی طرح بچ نہ سکیگا۔ اسی طور پر ایک مسلمان بھی اگر کسی غیر اسلامی نظام حکومت میں رہ کر اسلامی اصول پر زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کا کامیاب ہونا بھی محال ہے۔ جن قوانین کو وہ باطل سمجھتا ہے، جن ٹیکسوں کو وہ حرام سمجھتا ہے، جن معاملات کو وہ ناجائز سمجھتا ہے، جس طرز زندگی کو وہ فاسد سمجھتا ہے، جس طریق تعلیم کو وہ مہلک سمجھتا ہے، وہ سب کے سب اس پر، اسکے گھر بار پر، اس کی اولاد پر اس طرح مسلط ہو جائینگے کہ وہ کسی طرح انکی گرفت سے بچ کر نہ نکل سکیگا۔ لہٰذا جو شخص یا گروہ کسی مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو وہ اپنے اعتقاد کے فطری اقتضا ہی سے اس امر پر مجبور ہوتا ہے کہ مسلکِ مخالف کی حکومت کو مٹانے اور خود اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے مسلک پر عمل کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اس

---

[1] ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہو۔

[2] اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ ہوگا اور بڑا فساد برپا رہیگا۔

[3] خدا ہی نے اپنے رسول کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح ضابطہ دیکر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں کو مٹا کر اس ایک اطاعت کو سب پر غالب کر دے خواہ وہ لوگ اس پر راضی نہ ہوں جو خداوندی میں دوسروں کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

کوشش سے غفلت برتتا ہے تو اس کا صریح معنی یہ ہے کہ وہ درحقیقت اپنے اعتقاد ہی میں جھوٹا ہے:

عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ ۝ لَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ یُّجَاھِدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ۔۔۔ اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

(التوبہ ۔ ۷)

"اے نبی! خدا تمہیں معاف کرے، تم نے ان لوگوں کو جہاد کی شرکت سے علٰحدہ رہنے کی اجازت کیوں دے دی حالانکہ جہاد ہی وہ کسوٹی ہے جس سے تم پر کھل سکتا ہے کہ اپنے ایمان میں سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟ جو لوگ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہیں کر سکتے کہ انہیں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنے سے معذور رکھا جائے۔۔۔۔۔۔ ایسی درخواست صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر"

ان الفاظ میں قرآن نے صاف اور صریح فتویٰ دیدیا ہے کہ اپنے اعتقاد (Conviction) میں کسی جماعت کے صادق ہونے کا واحد معیار یہی ہے کہ وہ جس مسلک پر اعتقاد رکھتی ہو اس کو حکمراں بنانے کے لیے جان و مال سے جہاد کرے۔ اگر تم مسلکِ مخالف کی حکومت کو گوارا کرتے ہو تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ تم اپنے اعتقاد میں جھوٹے ہو، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ آخرکار اسلام کے مسلک پر تمہارا نام نہاد عقیدہ بھی باقی نہ رہے گا۔ ابتدا میں تم مسلکِ مخالف کی حکومت کو بکراہت گوارا کروگے، پھر رفتہ رفتہ تمہارے دل اس سے مانوس ہوتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ کراہت رغبت سے بدل جائیگی، اور آخر میں نوبت اس حد تک پہنچیگی کہ مسلکِ مخالف کی حکومت قائم ہونے اور قائم رہنے میں تم خود مددگار بنوگے، اپنی جان و مال سے جہاد اس لیے کروگے کہ مسلکِ اسلام کے بجائے مسلکِ غیر اسلام قائم ہو یا قائم رہے، تمہاری اپنی طاقتیں مسلکِ اسلام کے قیام کی مزاحمت میں صرف ہونے لگینگی، اور یہاں پہنچ کر تم میں اور کافروں میں اسلام کے منافقانہ دعوے، ایک بدترین جھوٹ، ایک پُرفریب نام کے سوا کوئی فرق نہ رہیگا۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نتیجہ کو صاف صاف بیان فرمادیا ہے:

والذی نفسی بیدہ لتامرن — اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یا تو

بالمعروف ولتنھن عن المنکر او لتاخذن بید المسیٔ ولتطرنہ علی الحق اطراً او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض ولیلعنکم کما لعنھم

تمہیں ایسا کرنا پڑیگا کہ نیکی کا حکم کرو اور بدی سے روکو، اور بدکار کا ہاتھ پکڑلو اور اسے حق کی طرف بزور موڑ دو، یا پھر اللہ کے قانون فطرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہیگا کہ بدکاروں کے دلوں کا اثر تمہارے دلوں پر بھی پڑ جائے اور انکی طرح تم بھی ملعون ہو کر رہو۔

عالمگیر انقلاب اس بحث سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ اسلامی جہاد کا مقصود (Objective) غیر اسلامی نظام کی حکومت کو مٹا کر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے۔ اسلام یہ انقلاب صرف ایک ملک یا چند ملکوں میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں برپا کرنا چاہتا ہے اگرچہ ابتداءً مسلم پارٹی کے ارکان کا فرض یہی ہے کہ جہاں جہاں وہ رہتے ہوں وہاں کے نظام حکومت میں انقلاب پیدا کریں، لیکن ان کی آخری منزل مقصود ایک عالمگیر انقلاب World revolution کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی انقلابی مسلک جو قومیت کے بجائے انسانیت کی فلاح کے اصول لیکر اٹھا ہو، اپنے انقلابی مطمح نظر کو کبھی ایک ملک یا ایک قوم کے دائرے میں محدود نہیں کرسکتا، بلکہ وہ اپنی فطرت کے عین اقتضا ہی سے مجبور ہے کہ عالمگیر انقلاب کو اپنا مطمح نظر بنائے۔ حق جغرافی حدود کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہیں اگر کسی دریا یا پہاڑ کے اس پار حق ہوں تو اس پار بھی حق ہی ہوں۔ نوع انسانی کے کسی حصہ کو بھی مجھ سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ انسان جہاں بھی ظلم و ستم کا اور افراط و تفریط کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے وہاں اسکی مدد کے لیے پہنچنا میرا فرض ہے۔

اسی تخیل کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا (النساء - ۱۰)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں ان مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جنہیں کمزور پاکر دبا لیا گیا ہے اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے کارفرما ظالم ہیں۔

علاوہ بریں قومی اور ملکی تقسیمات کے باوجود انسانی تعلقات و روابط کچھ ایسی عالمگیری اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کرسکتی جب تک کہ ہمسایہ ممالک میں بھی وہی اصول و مسلک رائج

نہ ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لیے اصلاح عمومی اور تحفظ خودی، دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطہ میں اسلامی نظام کی حکومت قائم کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ جہاں تک اسکی قوتیں ساتھ دیں، اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی، اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دیگی کہ اس مسلک کو قبول کریں جس میں انکے لیے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دیگی اور انکی جگہ اسلامی حکومت قائم کریگی۔

یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب، جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی، سب سے پہلے اسی کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول و مسلک کی طرف دعوت دی۔ مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں، بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرت کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومت پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔ مصر و شام اور روم و ایران کے عوام اوّل اوّل اسکو عرب قوم کی امپیریلیسٹ پالیسی سمجھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ جسطرح پہلے ایک قوم دوسری قوموں کو غلام بنانے کے لیے نکلا کرتی تھی اسی طرح اب بھی ایک قوم اسی غرض کے لیے نکلی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر یہ لوگ قیصر و کسریٰ کے جھنڈے تلے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلے۔ مگر جب ان پر مسلم پارٹی کے انقلابی مسلک کا حال کھلا، جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ جفاکار قوم پرستی (Aggressive nationalism) کے علمبردار نہیں ہیں بلکہ یہ قومی اغراض سے پاک ہو کر ایک عادلانہ نظام قائم کرنے آئے ہیں، اور ان کا مقصد ان ظالم طبقوں کی خداوندی کو ختم کرنا ہے جو قیصریت و کسرویت کی پناہ میں ہم کو تباہ و برباد کر رہے ہیں، تو ان کی اخلاقی ہمدردیاں مسلم پارٹی کی طرف جھک گئیں، وہ قیصر و کسریٰ کے جھنڈے سے الگ ہوتے چلے گئے، اور اگر مارے باندھے سے فوج میں بھرتی ہو کر لڑنے آئے بھی تو بے دلی سے لڑے۔ یہی سبب ہے ان حیرت انگیز فتوحات کا جو ابتدائی دور میں مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، اور یہی سبب ہے اسکا کہ اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد جب ان ممالک کے باشندوں نے اسلامی نظام اجتماعی کو عملاً کام کرتے ہوئے دیکھا تو وہ خود اس بین الاقوامی پارٹی میں شریک ہوتے چلے گئے، اور خود اس مسلک کے

علمبردار بن کر آگے بڑھے تاکہ دوسرے ملکوں میں بھی اس کو پھیلا دیں۔

جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم غیر متعلق ہے یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر جب آپ غور کریں گے تو یہ بات بآسانی آپ کی سمجھ میں آجائیگی کہ جنگ کی جو تقسیم جارحانہ (Aggressive) اور مدافعانہ (Defensive) کی اصطلاحوں میں کی گئی ہے، اس کا اطلاق سرے سے اسلامی جہاد پر ہوتا ہی نہیں۔ یہ تقسیم صرف قومی اور ملکی لڑائیوں ہی پر منطبق ہو سکتی ہے کیونکہ اصطلاحاً "حملہ" اور "مدافعت" کے الفاظ ایک ملک یا ایک قوم کی نسبت سے ہی بولے جاتے ہیں۔ مگر جب ایک بین الاقوامی پارٹی ایک جہانی نظریہ و مسلک کو لیکر اٹھے اور تمام قوموں کو انسانی حیثیت سے اس مسلک کی طرف بلائے، اور ہر قوم کے آدمیوں کو مساویانہ حیثیت سے اپنی پارٹی میں شریک کرے، اور محض مسلکِ مخالف کی حکومت کو مٹا کر اپنے مسلک کی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے، تو ایسی حالت میں اصطلاحی حملہ اور اصطلاحی مدافعت کا قطعاً کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اگر اصطلاح سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی اسلامی جہاد پر جارحانہ اور مدافعانہ کی تقسیم منطبق نہیں ہوتی۔ اسلامی جہاد بیک وقت جارحانہ بھی ہے اور مدافعانہ بھی۔ جارحانہ اسلیے کہ مسلم پارٹی مسلکِ مخالف کی حکمرانی پر حملہ کرتی ہے۔ اور مدافعانہ اسلیے ہے کہ وہ خود اپنے مسلک پر عامل ہونے کے لیے حکومت کی طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ پارٹی ہونے کی حیثیت سے اس کا کوئی گھر نہیں کہ وہ اسکی مدافعت کرے۔ اسکے پاس محض اپنے اصول ہیں جنکی وہ حمایت کرتی ہے۔ اسی طرح مخالف پارٹی کے بھی گھر پر وہ حملہ نہیں کرتی بلکہ اصولوں پر حملہ کرتی ہے، اور اس حملہ کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اس سے زبردستی اسکے اصول چھڑائے جائیں، بلکہ مدعا صرف یہ ہے کہ اسکے اصولوں سے حکومت کی طاقت چھین لی جائے۔

ذمیوں کی حیثیت یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام کی حکومت میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو کسی دوسرے عقیدہ و مسلک کے متبع ہوں۔ اسلام کا جہاد لوگوں کے عقیدہ و مسلک اور ان کے طریق عبادت یا قوانین معاشرت سے تعرض نہیں کرتا۔ وہ ان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں اور جس مسلک پر چاہیں چلیں۔ البتہ وہ انکے اس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ایسے کسی طریقہ پر حکومت کا نظام چلائیں جو اسلام کی نگاہ میں فاسد ہے۔ نیز وہ ان کے اس حق کو بھی نہیں مانتا کہ وہ معاملات کے اُن طریقوں کو اسلامی نظام حکومت میں جاری رکھیں جو اسلام کے نزدیک اجتماعی فلاح کے لیے مہلک ہیں۔ مثلاً وہ حکومت کا نظام ہاتھ میں لیتے ہی سودی کاروبار کی تمام صورتوں کو مسدود

کردیگا۔ جوے کی ہرگز اجازت نہ دیگا۔ خرید و فروخت اور مالی لین دین کی ان تمام شکلوں کو روک دیگا جو اسلامی قانون میں حرام ہیں۔ قحبہ خانوں اور فواحش کے اڈوں کو کلیتہً بند کردیگا۔ غیر مسلم عورتوں کو ستر کم سے کم حدود کی پابندی پر مجبور کریگا اور انہیں تبرج جاہلیت کے ساتھ پھرنے سے روک دیگا۔ سینما پر احتساب قائم کریگا اور تمام غیر اخلاقی عناصر کو اس سے نکال دیگا۔ کسی گروہ کو مخلوط تعلیم کی اجازت نہ دیگا۔ اس قسم کے اور بہت سے امور ہیں جن میں ایک اسلامی نظام حکومت نہ صرف اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر، بلکہ خود اپنے تحفظ (Self-defence) کی خاطر بھی ان تمدنی معاملات کی اجازت نہ دیگا جو غیر مسلموں کے مسلک میں چاہے ناجائز نہ ہوں، مگر اسلام کی نگاہ میں موجب فساد و ہلاکت ہیں۔

اس باب میں اگر کوئی شخص اسلام پر ناروا داری کا الزام عائد کرے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ دنیا کے کسی انقلابی و اصلاحی مسلک نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ اتنی رواداری نہیں برتی ہے، جتنی اسلام برتتا ہے۔ دوسری جگہ تو آپ دیکھینگے کہ غیر مسلک والوں کے لیے زندگی دوبھر کردی جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ وطن چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام غیر مسلک والوں کو پورے امن کے ساتھ ہر قسم کی ترقی کرنے کا موقع دیتا ہے، اور ان کے ساتھ ایسی فیاضی کا برتاؤ کرتا ہے جسکی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

امپیریلزم کا شبہ یہاں پہنچ کر مجھے پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں جہاد صرف وہی ہے جو محض فی سبیل اللہ ہو، اور اس جہاد کے نتیجہ میں جب اسلامی حکومت قائم ہو تو مسلمانوں کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ قیصر و کسریٰ کو ہٹا کر خود انکی جگہ لے لیں۔ مسلمان اس لیے نہیں لڑتا اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں لڑ سکتا کہ اسکی شخصی حکومت قائم ہوجائے، اور وہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنالے اور ناجائز طور پر لوگوں کی گاڑھی محنتوں کا روپیہ وصول کرکے اپنی نفس پرستی میں صرف کرنے لگے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں بلکہ جہاد فی سبیل الطاغوت ہے، اور ایسی حکومت کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کا جہاد تو ایک خشک اور بے مزہ محنت ہے جس میں جان، مال، اور خواہشات نفس کی قربانی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر یہ جہاد کامیاب ہو اور نتیجہ میں حکومت مل جائے تو سچے مسلمان حکمراں پر ذمہ داریوں کا اس قدر بھاری بوجھ عائد ہوجاتا ہے کہ اس غریب کے لیے راتوں کی نیند اور دن کی آسائش تک حرام ہوجاتی ہے، اگر اسکے معاوضہ میں وہ حکومت و

اقتدار کی اُن لذتوں میں سے کوئی لذت بھی حاصل نہیں کر سکتا جنکی خاطر دنیا میں عموماً حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام کا فرمانروا نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے، نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے، نہ اپنے آگے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے، نہ قانون شریعت کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے، نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز یا دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز مطالبے سے بچا سکے، نہ وہ حق کے خلاف ایک حبہ لے سکتا ہے اور نہ چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے، ایک متوسط درجہ کے مسلمان کو زندگی بسر کرنے کے لیے جتنی تنخواہ کافی ہو سکتی ہے اس سے زیادہ بیت المال سے ایک پائی لینا بھی اسکے لیے حرام ہے، وہ عزیشان عالی شان قصر بنوا سکتا ہے، نہ خدم و حشم رکھ سکتا ہے، نہ عیش و عشرت کے سامان فراہم کر سکتا ہے۔ اس پر ہر وقت یہ خوف غالب رہتا ہے کہ ایک دن اسکے اعمال کا سخت حساب لیا جائیگا اور اگر حرام کا ایک پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ، ظلم و بے انصافی کا ایک دھبہ اور خواہشات نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اسکے حساب میں نکل آیا تو اسے سخت سزا بھگتنی پڑیگی۔ اگر کوئی شخص حقیقت میں دنیا کا لالچی ہو تو اس سے بڑا کوئی بے وقوف نہ ہوگا اگر وہ اسلامی قانون کے مطابق حکومت کا بار سنبھالنے پر آمادہ ہو، کیونکہ اسلامی حکومت کے فرمانروا سے بازار کے ایک معمولی دوکاندار کی پوزیشن زیادہ اچھی ہوتی ہے وہ دن کو خلیفہ سے زیادہ کماتا ہے اور رات کو آرام سے پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔ خلیفہ بیچارے کو نہ اسکے برابر آمدنی نصیب اور نہ رات کو چین سے سونا ہی نصیب۔

یہ بنیادی فرق ہے اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت کا۔ غیر اسلامی حکومت میں حکمراں گروہ اپنی خداوندی قائم کرتا ہے اور اپنی ذات کے لیے ملک کے وسائل و ذرائع کو استعمال کرتا ہے۔ بخلاف اسکے اسلامی حکومت میں حکمران گروہ مجرد خدمت کرتا ہے اور عام باشندوں سے بڑھ کر اپنی ذات کے لیے کچھ حاصل نہیں کرتا۔ اسلامی حکومت کی سول سروس کو جو تنخواہیں ملتی تھیں، ان کا تقابل آج کل کی یا خود اُس دور کی امپیریلسٹ طاقتوں کی سول سروس کے مشاہروں سے کر کے دیکھیے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کی جہانکشائی اور امپیریلزم کی عالمگیری میں روحی و جوہری فرق کیا ہے۔ اسلامی حکومت میں خراسان، عراق، شام اور مصر کے گورنروں کی تنخواہیں آپ کے معمولی انسپکٹروں کی تنخواہوں سے بھی کم تھیں۔ خلیفہ

اول حضرت ابوبکر صدیقؓ صرف سو روپے مہینہ پر اتنی بڑی سلطنت کا انتظام کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے سے زیادہ نہ تھی، درانحالیکہ بیت المال دنیا کی دو عظیم الشان سلطنتوں کے چھوڑے ہوئے خزانوں سے بھرپور ہو رہا تھا۔ اگرچہ ظاہر میں امپیریلزم بھی ملک فتح کرتا ہے اور اسلام بھی مگر دونوں کے جوہر میں زمین و آسمان کا بل ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

حضرات! یہ ہے اُس جہاد کی حقیقت جس کے متعلق آپ بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ آج اسلام اور مسلم جماعت اور جہاد کا وہ تصور جو تم پیش کر رہے ہو کہاں غائب ہو گیا، اور کیوں دنیا بھر کے مسلمانوں میں کہیں بھی اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، تو میں عرض کرونگا کہ یہ سوال مجھ سے نہ کیجیے بلکہ ان لوگوں سے کیجیے جنہوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کے اصلی مشن سے ہٹا کر تعویذ گنڈوں اور عملیات اور مراقبوں اور ریاضتوں کی طرف پھیر دی۔ جنہوں نے نجات اور فلاح اور حصول مقاصد کے لیے شارٹ کٹ تجویز کیے تاکہ مجاہدے اور جانفشانی کے بغیر سب کچھ تسبیح پھرانے یا کسی صاحب قبر کی عنایات حاصل کر لینے ہی سے میسر آجائے۔ جنہوں نے اسلام کے کلیات اور اصول اور مقاصد سب کو لپیٹ کر تاریک گوشوں پھینکدیا اور مسلمانوں کے ذہن کو آمین بالجہر اور رفع یدین اور ایصال ثواب و زیارت قبور اور اسی قسم کے بے شمار جزئیات میں ایسا پھنسایا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصد تخلیق کو اور اسلام کی حقیقت کو قطعی بھول گئے۔ اگر اس سے بھی آپ کی تشفی نہ ہو تو پھر یہ سوال ان امراء اور اصحاب اقتدار کے سامنے پیش کیجیے جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر قرآن کے قانون اور محمد صلعم کی ہدایت کا اس سے زیادہ کوئی حق اپنے اوپر تسلیم نہیں کرتے کہ کبھی ختم قرآن کرا دیں اور کبھی عید میلاد کے جلسے کرا دیں اور کبھی اللہ میاں کو نعوذ باللہ انکی شاعری کی داد دے دیا کریں۔ رہا اس قانون اور ہدایت کو عملاً نافذ کرنا، تو یہ حضرات اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ سمجھتے ہیں، کیونکہ درحقیقت انکا نفس ان پابندیوں کو قبول کرنے اور ان ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے جو اسلام ان پر عائد کرتا ہے۔ یہ بڑی سستی نجات کے طالب ہیں۔

قرآن کا چیلنج سائنس کی روشنی میں

از جناب سید غلام وارث صاحب پروفیسر سائنس گورنمنٹ کالج ہوشیارپور

تقریباً چودہ صدیاں گذری ہیں کہ قرآن حکیم نے دنیا کو چیلنج دیا تھا کہ اگر کسی کو اس کتاب کے منجانب اللہ ہونے میں ذرا بھی شک ہے تو کوئی انسان جسے اپنی انشاپرداز ہو، خود یا دیگر ارباب عقل و فن کی مدد لیکر ایک سورۃ قرآن جیسی مقابلہ کے لیے بنا لائے۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا نہ ہوسکیگا۔ جتنا ہم اس چیلنج پر بہ نظر امعان غور کرتے ہیں اتنا ہی ہمیں قرآن کا مدمقابل پیش کرنے سے عاجزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو ہم قرآن پر جس نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالیں اسکے مضمون میں اتنے نکات پاتے ہیں کہ انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ لیکن جو لوگ متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں وہ ٹھوکر کھاتے ہیں، کیونکہ جہاں ان کی عقل کی روشنی گل ہو جاتی ہے وہاں قبلہ نما کی سوئی راہ دکھاتی نظر نہیں آتی۔ البتہ جب ان دھندلے مقامات پر بعد کی تحقیقات روشنی ڈالنے لگتی ہیں اور انسانی علم کی حدود ذرا وسیع ہوتی ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ قبلہ نما کی سوئی کی طرح قرآن ہمیں اسی جانب ہدایت دے رہا تھا۔ اس مقالہ میں قرآن کی صرف ایک آیہ مبارکہ سے بتایا جائیگا کہ کس طرح صرف ایک فقرہ میں اس وحی الٰہی نے تکوین رحمتِ باراں کے متعلق وہ تمام کیفیتیں بیان کردی ہیں جو آج سے دو تین سو سال پیشتر کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ سورہ نور میں ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَہٗ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ رُکَامًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِہٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْھَا مِنْ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُہٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْھَبُ بِالْاَبْصَارِ

مصدر اِزجاء کے معنی ہیں کسی ریوڑ کو تیر کا دباؤ ڈالکر آہستہ آہستہ چلانا۔ تزجیہ بھی اسی مادہ سے نکلا ہے جسکے معنی ہیں کسی ماکول یا مشروب سے سیر ہو جانا۔ پس آیہ کریمہ کے پہلے ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوا کہ کیا تو نہیں دیکھتا کہ

اللہ تعالیٰ بادل کو (بخارات آبی سے سیر کرکے ہوا کا) دباؤ ڈالکر (جسے موسمی نقشہ جات Weather charts میں تیر کے نشان سے ظاہر کیا جاتا ہے) (سمندر کی جانب سے خشکی کی طرف) آہستہ آہستہ دھکیلتا ہے"۔ یہی مفہوم یُزۡجِیۡ کا اس آیہ کریمہ میں ہے۔

یہ یاد رہے کہ اگر ہوا بادلوں کو تیز چلائے تو بادل منتشر ہو جائیں اور بارش نہ ہو۔ اسی لیے آگے آتا ہے ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیۡنَہٗ "وہ پھر اسکے درمیان الفت یا کشش پیدا کرتا ہے"۔ یہ الفت کیوں پیدا ہوئی؟ اس کشش کی کیا ماہیت ہے؟ لفظ ثُمَّ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کشش ثقل (Gravitational force) نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ تو ہر مادہ میں ابتداً موجود ہے۔ اب کوئی ایسی باہمی کشش پیدا ہوئی ہے جو پہلے ان بخارات کے ذروں میں موجود نہ تھی۔ سائنس داں اسے تجاذب برقی کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات تحقیق نہیں ہوئی کہ آیا یہ بجلی کا پیدا ہونا تبخیر کی وجہ سے ہے یا ہوا کی رگڑ سے۔ الفاظ ودق اور برق اسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ ایجابی (Positive) اور سلبی (Negative) اقسام برق کے مابین باہمی کشش ہوتی ہے جو انکو ایک دوسرے کے قریب اور پھر قریب تر لاتی ہے۔ اور جوں جوں درمیانی فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے کشش بڑھتی جاتی ہے۔ (قانون معکوس مربعات بعد) (Law of inverse square)۔ غور فرمایئے کہ لفظ یُؤَلِّفُ کی تشدید نے اس باہمی کشش کے تشدد کو ایک عجیب قدرتی رنگ دیدیا ہے کہ جو خیال اس کے پڑھتے وقت ذہن میں پیدا ہو آواز بھی اسکی تائید مزید کرے۔

بَیۡنَہٗ کی ترکیب پر غور کیجیے۔ مفرد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور بَیۡنَ دو چیزوں کے درمیان کے لیے۔ یہاں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل کی مفرد ٹکڑی میں جو بظاہر مسلسل نظر آتی ہے تواتر نہیں۔ یہ (Particulate) ہے یعنی علحدہ علحدہ ذرات سے بنی ہوئی ہے اس سے اس مقبول عام نظریہ سالمات کی تائید میں ایک جھلک سی نظر آرہی ہے جو موجودہ قصر سائنس کا سنگِ بنیاد ہے۔

ثُمَّ یَجۡعَلُہٗ رُکَامًا۔ رُکَام کے معنی ہیں۔ (۱) انبار لگانا۔ تہ پر تہ چڑھانا۔ (۲) متصل کرکے مختصر کر دینا۔ (۳) کثیف ہو جانا۔

یعنی پھر اللہ تعالیٰ ان اجزاء سحاب کو جو آبی بخارات کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے، مالوف و مجتمع کرکے، تہ پر تہ

چڑھاکر، مختصر اور کثیف بناکر پانی کے قطرات بناتا ہے۔ سائنسدان جانتے ہیں کہ گیس اور مائع میں فرق یہی صرف اتنا ہے کہ گیس یا بخارات کے ذرات بکھرے ہوئے لطیف شکل میں ہوتے ہیں اور مائع میں زیادہ قریب اور غلیظ شکل میں ہوتے ہیں۔ اور ٹھوس میں اور بھی زیادہ قریب اور کثیف صورت میں۔ اس کام کے دو نتیجے ہوئے۔

(۱) جب بے شمار خوردبینی ذرات مجتمع ہوکر ایک بڑے قطرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو جیسا کہ مہندس جانتے ہیں اس بڑے قطرے کی بیرونی سطح ان تمام جزوی ذرات کی سطحوں کے مجموعے سے بہت کم ہوتی ہے۔ جو برقی اثاثہ (Charge) انفرادی طور پر ان میں تھا وہ کم سطح پر پھیلیگا اس لیے اسکی کثافت برقی بڑھ جائیگی یہاں تک کہ اس میں سمانہ سکیگی اور اسی طرح خارج ہونیکی کوشش کریگی جس طرح ایک (Leyden jar) میں گنجائش (Capacity) سے زیادہ بجلی بھرنے سے بجلی کود کر نکل جاتی ہے۔

(۲) جب چھوٹے ذرات ہم آغوش ہوکر بڑا قطرہ بنے تو مائعات کے سطحی تناؤ (Surface tension) میں جو ایک قسم کی توانائی (Energy) ہے، اس میں کچھ بچت ہو گئی لیکن چونکہ توانائی میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، صرف تغیر شکل ہو سکتا ہے (Law of conservation of energy) اس لیے وہ سطحی کھچاؤ کی طاقت بھی برق کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ یعنی اس دوسری وجہ سے بھی برقی کثافت افزوں ہو گئی اور قطرے سے نکلنے کو تلملائی۔

اسی لیے آگے آتا ہے فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ

ودق کے معنی لغت میں یہ ہیں (۱) رِس رِس کر نکلنا - (۲) پلپلا ہونا پیٹ کا - (۳) گرمایا ہوا ہونا کسی جانور کا) (۴) آنکھوں میں سرخی آجانا بوجہ گرمائے ہوئے ہونیکے - (۵) تلوار جیسی تیز چیز - چونکہ یہ بطور اسم مستعمل ہوا ہے لہٰذا اس کے معنی ہوئے (۱) وہ چیز جو رِس رِس کر نکلے - (۲) وہ چیز جو قطرے کے پیٹ کو پلپلا کر رہی ہے یعنی ذخیرہ آب - (۳) وہ چیز جو گرمائی ہوئی حالت میں نکلے یا گرمائی ہوئی ہو یا گرمانے والی ہو - اسکی آنکھیں سرخ ہوں بوجہ گرمائی توانائی کے یا اسکو دیکھنے والی آنکھ خونریز ہو جائے (۴) یا تلوار کے مانند تیز شے - پس ودق کے لفظ سے دو مفہوم پیدا ہوئے:

(۱) ذخیرہ آب یعنی بارش جو قطرے کے پیٹ کو پلپلا کر رہی ہے۔

(۲) بجلی جو قطرے کو مُکام ہونے کی وجہ سے تیز ہو گئی ، جب کا حملہ تلوار سے زیادہ تیز ہوتا ہے کہ درخت کاٹ پھینکتی ہے ، اور گرم اتنی کہ الکو جلا بھی دیتی ہے ، دیکھنے میں ایسی خون آشام اور شعلہ فگن کہ آنکھ تاب ہی نہیں لا سکتی۔

خِلَل کے معنی ہیں (۱) کپڑے یا اوڑھنی میں انشقاق ہو جانا۔ (۲) وہ غلاف جس میں بارش کا قطرہ گھرا ہوا ہے۔ (۳) تلوار کی نیام (۴) ترشائی آجانا۔

اگر ودق بمعنی ذخیرۂ آب (جو قطرے کے پیٹ کو پلپلا کر رہا ہے) اور خِلل بمعنی بارش کے قطرے کا بیرونی سطحی غلاف لیا جائے تو اس فقرے کا مطلب یہ ہوگا :

"پس تو دیکھتا ہے یا دیکھیگا اس ذخیرۂ آب کو جو قطرے کے پیٹ کو پلپلا کر رہا ہے اپنے بیرونی خول (سطح) میں دراڑ کر کے رس رس کر باہر نکلتا ہوا"

اگر ودق سے مراد برقی اثاثہ لیا جائے اور خِلل سے مراد تیزابیت آجانا ، ترشا جانا ، تو اس کا مطلب یہ ہوگا :۔

"پس تو دیکھیگا یا دیکھتا ہے کہ یہ بجلی نکل آتی ہے اس قطرے کے ترشا جانے سے" یہاں مِنْ کا وہی مفہوم ہوگا جو آیہ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ میں ہے۔

اس پر ذرا غور فرمائیے۔ فیریڈے کے تجربہ (Ice-pall experiment) اور (Butterfly net experiment) سے دکھایا جا سکتا ہے کہ بجلی کسی موصل (Conductor) کی اندرونی سطح پر نہیں رہ سکتی۔ مثلاً اگر ہم کوئی دھات کا برتن لیں جو شیشہ یا آبنوس (غیر موصل) پر لٹکا ہوا ہو اور ریشم کے دھاگے سے ایک پیتل کی گولی لٹکا کر اور اس گولی کو برقا کر برتن کی اندرونی سطح چھوا دیں تاکہ بجلی گولی سے نکل کر برتن کی اندرونی سطح پر آجائے تو وہ بجلی فوراً برتن میں سرایت کرتے ہی بیرونی سطح پر نکل آئیگی۔ لیکن اگر برتن غیر موصل ہو تو وہ بجلی اندر کی جانب رہ سکیگی۔ یہ حقیقت بالکلیہ پچھلی صدی کی تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ "برق کسی موصل شے کی اندرونی سطح پر نہیں رہ سکتی بلکہ بیرونی سطح پر مستقر ہوتی ہے" نیز یہ حقیقت بھی ماضی قریب میں ہی منکشف ہوئی ہے کہ خالص پانی غیر موصل ہے لیکن تیزابیت آجانے سے وہ موصل بن جاتا ہے یعنی ترش ہو کر اپنے اندر سے بجلی گذرنے دیتا ہے (یہ ترشائی بجلی کی وجہ سے ذرا سا شورے کا تیزاب (Nitric acid) بننے سے

پیدا ہوتی ہے)۔ لیکن قرآن نے صدیوں پیشتر بتایا تھا کہ یہ برقی اثاثہ اس کام کے بعد قطرے کے ہلکا سا تر شا جانے سے خورد بینی ذرات میں سے نکل کر بڑے آبی قطرے کی بیرونی سطح پر آ گیا، اور پھر جب وہ قطرہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر بجلی سے معمور ہو گیا تو وہ بجلی خارج ہونے کے لیے بے قرار ہوئی اور کڑک کر باہر نکل گئی۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ بارش کے قطرے کے لیے جو لفظ خِلٰل استعمال کیا گیا ہے اسکے معنی بیرونی غلاف یا اوڑھنی کے ہیں۔ اور یہ امر بھی جدید تحقیقات سے ہی معلوم ہوا ہے کہ مائعات کی بیرونی سطح ایک کھچے ہوئے غلاف کے مماثل ہے۔ اس تناؤ کو (Surface tension) کہتے ہیں۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ برق کا مفہوم کیوں لیا جائے جب بارش کے معنی موجود ہوں۔ لیکن تامل سے پتہ چلیگا کہ اگر صرف بارش کا مفہوم ہی ادا کرنا مقصود ہوتا تو یوں بھی کہا جا سکتا تھا ثم یخرج الودق من خللہ۔ لفظ "تری" کا ایزاد کرنا واضح کر رہا ہے کہ کوئی ایسی شے بھی بالتخصیص مراد ہے جو ظاہری آنکھ کو بادلوں سے نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ بجلی ہی ہے کیونکہ بارش کے قطرے تو اس وقت نظر آتے ہیں جب وہ زمین کے قریب آ جائیں۔ بادلوں کے قریب نکلتے ہوئے بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ آگے آتا ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ۔ یہاں جبال کے معنی اکثر مفسرین نے پہاڑ کے لیے ہیں حالانکہ آسمان میں کوئی پہاڑ نہیں۔ لیکن اگر مِنْ جبالٍ کے لفظ مِنْ کو تبدل منہ سمجھیں تو یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ "وہ اور (اللہ تعالیٰ) نازل کرتا ہے آسمان سے (یعنی پہاڑوں سے) خنکی کے باعث"۔ اور اگر لفظ جبال کو جَبَلَ جَبْلًا سے ماخوذ سمجھیں جس کے معنی ہیں مٹی اور پانی کو گوندھنا، تو اس کے معنی ہونگے پانی اور خاکی ذرات کا مخلوط یا ممزوج۔ سائنسدان اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ بارش کی تکوین کے لیے ہوا میں خاکی ذرات کا ہونا ضروری ہے جو اونچی سے اونچی جگہ پر بھی ہوا میں معلق رہتے ہیں۔ یوں تو نہیں اڑتے نظر نہیں آتے لیکن اگر اندھیرے کمرے میں سورج کی شعاعیں کسی سوراخ میں سے داخل ہوں تو منور ہو کر نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ ذرات بارش کے قطرات جمنے کے لیے (Nucleus) کا کام دیتے ہیں اور پانی کے قطرے کے وزن میں اضافہ کر کے زمین کی طرف اسے نازل کرتے ہیں۔ پس ان ذرات

خاکی کے ساتھ پانی کے امتزاج کو قرآن حکیم نے لفظ جبال سے تعبیر کیا ہے۔ اب مطلب صاف ہوگیا کہ "نازل ہوتی ہیں آسمان سے جہاں خنکی ہے پانی کے قطرات اور خاکی ذرات کی آمیزش سے بارش کی بوندیں"۔ اس صورت میں فیھا من برد بیان ہوگا سماء کا۔ اور اگر فیھا کو جبال کے ساتھ پڑھیں تو من برد کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں "خنکی (کی وجہ) سے"۔ خنکی تحلیل سے انقباض پیدا کرتی ہے اور بخارات جم کر پانی بنجاتے ہیں۔

اگر ہوا میں مٹی کا غبار نہ ہو تو بارش قطرے بنکر مناسب مقدار میں جگہ جگہ نہ برسے۔ بلکہ یا تو بارش ہو ہی نہیں (جب تک کہ آبی بخارات کسی ٹھنڈی سطح کو نہ چھوئیں) اور یا جونہی وہ کسی درخت یا عمارت سے ٹکرائیں سارے کا سارا آبی ذخیرہ انڈھل جائے اور ایسے طوفان آئیں کہ رحمت کی بجائے بارش زحمت بن جائے۔ اسی رمز کی طرف اشارہ ہے وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ۔ اسی طرح اگر آبی بخارات کو ٹھنڈک نہ پہنچے تو بادل ہوا میں تیرتے پھریں مگر کہیں بارش نہ ہو۔ پس ان دونوں اسباب کی طرف جو بارش کی تکوین کے لیے ضروری ہیں (یعنی خاکی ذرات جو فضاء میں اڑتے پھرتے ہیں اور برودت) قرآن مجید اس آیت کریمہ میں اشارہ کرتا ہے۔

آگے آتا ہے فَيُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَن مَّن يَشَاءُ "پس اللہ اپنی اس رحمت کو پہنچا دیتا ہے جس کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے اور جنکو بارش کی حاجت ہوتی ہے، اور جن طبقوں سے چاہتا ہے اسے روک لیتا ہے"۔ پس بعض ممالک سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں اور بعض قطعے صحرا بن جاتے ہیں۔

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ۔ قریب ہوتی ہے اسکی بجلی کی چمک کہ اچک لے جائے نظروں کو۔ بجلی کی چمک اتنی تیز ہوتی ہے کہ آنکھ کے اس فی الحس پردہ کو جہاں نظر آنے والی شئے کی تصویر بنتی ہے اور جسے (Retina) کہتے ہیں سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ اس پردے کی باریک شعری نالیوں (Capillaries) میں آنکھ کا خون جمع کرکے اسے بے حس کر دیتی ہے۔ اگر آنکھ فوراً بند نہ کر لی جائے تو دیر تک اثر قائم ہونے سے خون کے دباؤ سے یہ نالیاں پھوٹ ہی جائیں۔ اسی لیے بجلی کی طرف آنکھ ایک لحہ بھی دیکھے تو کچھ دیر تک کوئی شئے نظر نہ آئیگی جب تک کہ ان نالیوں کا خون دوبارہ پھیل کر وہ پردہ اپنی اصلی حالت پر نہ عود کر آئے۔

غور فرمائیے کہ وہ تمام حقائق جو اس ایک آیت میں درج ہیں آج سے تین چار سو سال پہلے کسی شخص کو بھی روئے زمین پر معلوم تھے؟ مثلاً

(۱) بادل منفرد ذرات سے بنا ہوا ہے۔ یہ خیال (Avogadro) نے ۱۸۱۱ء میں پیش کیا۔

(۲) ان اجزاء میں کشش پیدا ہوتی ہے جو پہلے موجود نہ تھی۔ برق کا پیدا ہونا اور اسکے تاثرات ۱۸۰۶ء کے بعد معلوم ہوئے۔

(۳) یہ خیال کہ مائعات کی بیرونی سطح کھچی ہوئی جھلی کے مانند ہوتی ہے جس میں شق ہونے کو خلل کہا گیا ہے۔

(۴) یہ مسلہ امر کہ بجلی چھوٹے ذرات سے نکل کر بڑے قطرے کی سطح پر آجاتی ہے۔

(۵) اور وہ اس لیے کہ پہلے پانی غیر موصل تھا اب ترشا جانے سے موصل بن گیا ہے جو تجربات سے دکھایا جاسکتا ہے۔

(۶) بارش کی تکوین خاک کے ذرات اور برودت سے ہوتی ہے۔

یہ سب باتیں ان علمی انکشافات میں سے ہیں جنکا علم آج سے ساڑھے تین سو سال قبل کسی کو نہ تھا۔ تو کیا یہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی زبردست دلیل نہیں کہ صدیوں پیشتر وہ رموزِ فطرت جو منصۂ شہود پر آنے والے تھے، ایسے سیدھے تُلے محتاط الفاظ میں بیان کر دیے کہ جو لوگ ان حقائق سے واقف نہ ہوں وہ گھبرائیں نہیں، اور جو ان سے واقف ہوں انہیں مزید بصیرت حاصل ہو۔ اور یہ الفاظ نکلتے ایسے پیغمبر (روحی فداہ) کی زبان مبارک سے ہیں جو تجربات و تعلیم دنیوی سے نا آشنا تھا، ازمنۂ مظلمہ میں پیدا ہوا، اور جسکی قوم میں بھی روشنی علم نہ پہنچی تھی۔ کیا اس ایک آیت کی بجلی جیسی روشنی انسانی بصیرت کو چکا چوند کرنے کے لیے کافی نہیں۔ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

اسلامی قانون معیشت

اسکی روح اور اسکے اصول

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق

جب کسی جگہ انسانوں کی کثیر تعداد سکونت پذیر ہو تو دوسرے تمدنی معاملات کے ساتھ ان کے معاشی امور کی تنظیم بھی ضروری ہوتی ہے، اور یہ دیکھنا حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ معاشی رجحانات غیر متوازن اور نامناسب ہونے پائیں۔ ورنہ اگر باشندوں کی اکثریت مثلاً صنعت و حرفت اور ملکی نظم و نسق میں مشغول ہو جائے اور جانوروں کی پرورش، غلہ کی کاشت اور اشیائے خوردنی کی فراہمی محض چند لوگوں تک محدود رہ جائے تو ان کی دنیوی زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر کچھ لوگوں نے کسب معاش کے لیے شراب کشید کرنے اور بت تراشی کا مشغلہ اختیار کر لیا تو عوام الناس میں خواہ مخواہ ان اشیاء کے معروف عام مفاسد پھیل کر رہیں گے اور ان کی اخلاقی زندگی برباد ہونے سے نہ بچ سکے گی۔ لیکن اگر حکومت لوگوں کو اس طرح بے راہ رو نہ ہونے دے اور تمدن کی بہبودی اور ملکی معیشت کے مصالح کی پوری نگہداشت کر کے پیشوں اور حصول رزق کے ذرائع کو لوگوں پر توازن کے ساتھ تقسیم کر دے اور انھیں غیر مفید اور ناجائز وسائل معاش اختیار کرنے سے روک دے تو جمہور کی زندگی نہایت آسائش اور سکون کے ساتھ گذرے گی۔

فساد تمدن زیادہ تر امراء کی نفس پرستیوں کا رہین منت ہوا کرتا ہے۔ وہ زندگی کی سادہ اور حقیقی ضروریات سے گذر کر دنیا کی زرگریوں کے شیدائی بن جاتے ہیں عام لوگ ان کے ان نفسانی میلانات کو دیکھ کر، اور انہی کو منفعت بخش پا کر انکی

شہوتِ نفس کی تسکین کے لیے طرح طرح کے طریقے ایجاد کرتے اور اپنی روزی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ایک گروہ لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دینے کے لیے تربیت گاہ کھولتا ہے۔ دوسرا رنگ برنگ کے قیمتی خوش نما اور منقش لباس فاخرہ تیار کرتا ہے۔ تیسرا حسین و دلفریب زیورات کی صنعت اختیار کر لیتا ہے۔ چوتھا اونچے اونچے خوبصورت ایوانات تعمیر کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ جب کسی بدقسمت ملک کی اکثریت ان وسائل معاش پر جھک پڑتی ہے تو دوسرے اہم تر وسائل معیشت اور مفید تر مشاغل تمدن متروک و مہجور ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو تھوڑے بہت بدنصیب ان پیشوں کو اختیار بھی کیے رہتے ہیں ان کی گردن ٹیکسوں کے بھاری بوجھ سے ناقابل برداشت حد تک دبی رہتی ہے، کیونکہ امراء کو ان تمام لوازم عیش و عشرت کی فراہمی کے لیے بے شمار دولت کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ دولت اس وقت تک جمع نہیں ہو سکتی جب تک کہ کاشتکاروں، تاجروں اور صناعوں کا پیٹ نہ کاٹا جائے۔ نیز یہ امراء اپنی قربانگاہ نفس کی نذروں سے اتنی فرصت ہی نہیں پاتے کہ حقیقی مصالح ملک و ملت پر ایک حبہ خرچ کر سکیں۔ انجام کار تمدن زہریلے مفاسد کی بھینٹ چڑھنا شروع ہوتا ہے اور یہ فساد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پوری قوم میں سرایت کر جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور سسک سسک کر جان دے دیتی ہے۔ دنیوی عروج سے یوں ہاتھ دھوتی ہے تو اخروی کا کمال کا پوچھنا ہی کیا۔

یہی وہ مرض ہے جو ظہور اسلام کے وقت عجمی ممالک پر مسلط تھا۔ لہٰذا خدا نے اپنے فرستادہ آخری روحانی طبیب کو اشارہ کیا کہ اس مرض مزمن کی جڑ کاٹ کر پھینک دے۔ اس طبیب حاذق نے مرض کی اچھی طرح تشخیص کر کے ان تمام منافذ کو بند کر دیا جن کے متعلق گمان غالب تھا کہ مرض کے جراثیم انھیں سے گذر کر پیکر انسانیت میں داخل ہوتے ہیں، اور صرف سلبی پہلو پر اکتفا نہ کیا بلکہ ایجاباً ایک صالح نظام معیشت کی بنا ڈالی جو خالص اصول فطرت پر مبنی تھا۔

معیشت کے فطری اصول و مبادی وہ فطری اصول و مبادی جن پر اسلامی قوانین معیشت کی بنا رکھی گئی ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو زمین پر پیدا کر کے ان کی روزی کا سامان بھی اسی زمین میں فراہم کیا، اور ان سب کے لیے زمین کے وسائل سے اکتساب رزق کو مباح کر دیا۔ پھر جب ان کے درمیان خود غرضانہ مسابقت (Competition) اور باہمی تنازع (strug le) کا سلسلہ شروع ہوا اور ہر فرد یہ ان تھک کوشش کرنے لگا کہ دوسروں کو محروم کر کے خود

زیادہ سے زیادہ وسائل معاش پر قابض ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس معضلۂ عام کو دور کرنے کے لیے یہ حکم نازل فرمایا کہ جو شخص کسی جگہ پر پہلے قابض ہو جائے، یا کسی وسیلۂ اکتساب رزق Means of livelihood کو پہلے حاصل کر لے تو اس سے نفع اٹھانے کا حق ترجیح اس کو حاصل ہے، اور دوسرا شخص اس حق سے اس کو محروم نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ پہلا شخص مبادلہ یا باہمی رضامندی سے اس کو دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اسی چیز کا نام "حق ملکیت" ہے اور اس کا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

من احییٰ ارضا میتۃ فھی لہ — جس شخص نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا، وہی اس زمین کا مالک ہے۔

مردہ زمین سے مراد بے کار پڑی ہوئی زمین ہے۔ اور اس کو زندہ کرنے سے مراد اسے کارآمد بنانا ہے۔

اس ارشاد نبوی کا فلسفہ وہی ہے جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے۔ حقیقی ملکیت اس کے سوا کسی کو نہیں پہنچتی۔ لیکن جب خدا نے اپنے بندوں کو اپنی اس ملکیت سے عام انتفاع کی اجازت دے دی تو طبعاً ان میں منافست اور منازعت پیدا ہوئی۔ اس کے سدباب کے لیے یہ حکم صادر کیا گیا کہ جس چیز پر ایک شخص پہلے پہل قابض ہو وہ اس کی ملک سمجھی جائے گی۔ لہٰذا جب کوئی شخص کسی افتادہ اور غیر مزروعہ زمین کو، جو آبادی کے احاطہ سے باہر ہو، سب سے پہلے اور دوسروں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر آباد کرے یا قابل انتفاع بنائے، تو وہ اس زمین کا مالک ہو جاتا ہے اور اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ زمین ساری کی ساری درحقیقت مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے جو مصلیوں اور مسافروں کے لیے وقف رہتی ہیں، اور سارے نمازی مسجد کے استعمال میں نیز سارے مسافر سرائے کے استعمال میں علی السویہ کے شریک اور مستحق ہیں۔ لیکن جو پہلے آکر کسی گوشہ کو گھیر لیتا ہے وہ اس خاص جگہ کے استعمال کرنے کا بہ نسبت دوسروں کے زیادہ مستحق ہو جاتا ہے۔ اور ملک کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان کسی شے سے انتفاع کا حق دوسروں کی نسبت زیادہ رکھتا ہے۔

اس اصول کو رسول اللہ صلعم نے ایک اور ارشاد میں یوں بیان فرمایا ہے:

عادی الارض للّٰہ و رسولہ ثم هی لکم منی — عادی الارض اللہ اور اسکے رسول کی ہے، اس کے بعد حق ملکیت تمہیں میرے واسطے سے پہنچتا ہے۔

"عادی الارض" اس زمین کو کہتے ہیں جو کسی وقت میں کسی قوم یا فرد کے قبضہ اور ملک میں رہی ہو مگر اب اس کے مالک ہلاک ہو چکے ہوں اور کوئی اس کی ملکیت کا مدعی باقی نہ رہا ہو۔ اس صورت میں زمین پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یعنی دوبارہ مباح بن جاتی ہے جیسی کہ ابتداءً تھی۔ اور جبکہ ایسی زمین اسلامی حکومت کے دائرہ اقتدار میں واقع ہو تو حکومت اس کی مالک ہے، اور وہ اسے پھر جن لوگوں کو چاہے استعمال کے لیے دے سکتی ہے۔

(۲) دوسرا فطری اصول معیشت یہ ہے کہ نظام تمدن ایسا ہو جس میں سب افراد جماعت حصہ لیں اور تعاون کریں اور بجز معذور لوگوں کے کوئی شخص تمدن کاروبار میں شریک ہونے سے خالی نہ رہے۔

(۳) تیسری اصل یہ ہے کہ جو چیزیں قدرت نے عام فائدے کے لیے بنائی ہیں اور جن کو کار آمد بنانے میں کسی خاص شخص یا گروہ کی محنت و قابلیت کا دخل نہیں ہے ان کو حتی الامکان اپنی اصل (یعنی اباحتِ عام) پر باقی رہنا چاہیے یعنی ہر شخص کو ان سے فائدہ اٹھانے کا حق ہونا چاہیے۔ اور اگر ان میں سے کوئی چیز ایسی ہو کہ اس سے فائدہ اٹھانا بغیر اسکے ممکن ہو کہ اسے روکا جائے، تو ایسی چیز کے لیے یہ ضابطہ ہونا چاہیے کہ ہر شخص کو جتنا روکنے کی ضرورت ہو بس وہ اتنا ہی روکے، اور پھر دوسروں کے لیے چھوڑ دے۔ مقصد یہ ہے کہ عام فائدے کی چیزوں میں کسی کو دوسرے پر تنگی کرنے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔ مثلاً گھاس اور چارہ اور جنگل کی لکڑیاں قدرت کا ایک عام انعام ہیں۔ ان کے پیدا ہونے میں کسی انسان کی محنت و کوشش کا دخل نہیں ہے، لہٰذا ان کو سب کے لیے عام ہونا چاہیے۔ کسی کو یہ حق نہ ہونا چاہیے کہ انہیں اپنے لیے مخصوص کر لے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا حمی الا للّٰہ و رسولہ — چراگاہیں کسی کی ملکیت نہیں وہ اللہ اور رسول کی ہیں۔

رؤسائے جاہلیت کا دستور تھا کہ وہ زرخیز اور شاداب چراگاہوں کو اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے اور ان سے انتفاع کی عوام کو اجازت نہیں دیتے تھے لیکن چونکہ یہ بات عوام کے حق میں سراسر ظلم اور غضب تھی اور ان کے لیے ضرر اور تنگی کا

باعث تھی اس لیے شریعت عادلہ نے چراگاہوں سے انسانی ملکیت کا حق سرے سے باطل کر دیا۔

ایک مرتبہ آنحضورؐ نے نمک کی ایک کان جو شہر مآرب میں تھی ایک شخص ابیض بن حمال کو دیدی۔ لیکن جب آپکو معلوم ہوا کہ اس کان سے نمک بغیر کسی خاص محنت و مشقت اور بغیر کسی خاص اہتمام و انتظام کے نکلتا ہے تو آپنے وہ اس سے واپس لے لی اور عام لوگوں کو اس سے استفادہ کا حق دیدیا۔ اس لیے کہ جو شے بغیر محنت و مشقت کے قابل انتفاع ہو، اسے ایک شخص کے لیے مخصوص کر دینا عوام کے حق میں سخت مضرت اور زحمت کا باعث تھا۔

یہی حال پانی کا ہے۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ مہزور نامی ندی (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصفیہ فرمایا تھا کہ جس شخص کا کھیت پہلے پڑے وہ پانی کو روک کر اپنے کھیت کو سیراب کرے اور جب پانی ٹخنوں تک پہنچ جائے تو اسے چھوڑ دے تاکہ بعد کے کھیت والا اپنی کاشت کو سیراب کر سکے۔ اسی طرح ایکے بعد دیگرے سب پانی لیتے جائیں۔ کسی کو محض اپنے ہی لیے روک رکھنے کا اختیار نہیں۔ یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ پانی جب مباح الاصل چیز تھی تو آپ نے کیوں ایک کو استعمال کا حق پہلے دیا اور دوسرے کو بعد میں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ جب کسی مباح چیز میں لوگوں کے حقوق مساوی ہوں تو انتظام عام کے لیے ضروری ہے کہ اس سے استفادہ کرنے میں ترتیب کا لحاظ رکھا جائے اور جس کا نمبر پہلے آئے اسے پہلے انتفاع کی اجازت دی جائے اور جس کا نمبر بعد میں ہو اسے بعد میں، ورنہ باہمی مخاصمت پیدا ہو کر سخت بدنظمی کی باعث ہوگی۔

(۴) لوگوں کا معاشی تعاون کے ذریعہ اپنے مال اور رزق کی ترقی میں سعی کرنا تمدن کی بقا اور فلاح کیلیے نہایت ضروری ہے۔ مثلاً ایک شہر سے دوسرے شہر میں تجارت کرنا، سعی و کوشش کر کے لوگوں کا مال بکوانا، اور رائج الوقت چیزوں کو پہلے سے بہتر بنانا یا اپنی قابلیت سے کوئی نئی چیز نکالنا، یہ سب قابل قدر کام ہیں جن پر بڑی حد تک لوگوں کی خوشحالی کا مدار ہے۔ لیکن جب ترقی اموال کے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جو تعاون کی روح سے خالی ہوں تو اصول فطرت کے لحاظ سے وہ بالکل ناجائز اور حکمتِ مدنیت کے حق میں سم قاتل ہونگے۔ جیسے قمار بازی اور سٹہ بازی وغیرہ اسی طرح اکتساب رزق کے جن ذرائع میں تعاون کی ظاہری شکل تو موجود ہو مگر ان میں تعاون کی موت چھپی ہوئی ہو وہ بھی حکمت

مدنیت کے خلاف ہیں مثلاً سودی کاروبار جس میں گو بظاہر مقروض معاملہ پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے لیکن دراصل یہ رضامندی زبردستی کی ہوتی ہے اور وہ بیچارہ اپنے افلاس کی خوفناکی سے گلوگرفتہ ہو کر اپنے لیے ایسی شرائط کے التزام کو تسلیم کرتا ہے جسے وہ اکثر اوقات پورا بھی نہیں کر سکتا۔ اکتساب مال کے یہ طریقے تمدن کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور یہیں سے وہ ملعون زرپرستی پیدا ہوتی ہے جو مدنیت کی حکمتوں اور برکتوں کا گلا گھونٹ کر عوام الناس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتی ہے۔

اہم ترین مفسدات تمدن کا کلی انسداد یہی وہ فطری اصول و مبادی ہیں جن پر اسلام کا معاشی قانون مبنی ہے۔ ہر وہ ذریعۂ معاش جو ان اصولوں کی روح سے بیگانہ یا ان کا مخالف ہو، حرام اور ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تجارت کی بے شمار اقسام اسی زاویۂ نظر کی وجہ سے مردود اور ناقابلِ مواخذہ ٹھیرائی گئی ہیں۔ ان اقسام میں سب سے مذموم اور مضرت رساں وہ قسم ہے جسے ربوٰ کہا جاتا ہے۔ اہل جاہلیت بیع و ربوٰ میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے (انما البیع مثل الربوٰ) لیکن اسلام نے بیع کو حلال اور ربوٰ کو حرام کیا، کیونکہ بیع میں تمدن کے لیے زندگی ہے اور ربوٰ میں تمدن کی موت ہے۔ اگرچہ بظاہر ربوٰ بھی بیع کی طرح تراضی طرفین سے ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس میں تراضی نہیں ہوتی۔ سود پر قرض لینے والا اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر دستاویز پر دستخط کرتا ہے، ورنہ وہ پاگل نہیں ہوتا کہ ننوے کر سوا سو دینے کا برضا و رغبت اقرار کرے۔ اس نقص کے علاوہ سودی معاملات جن خطرات اور مناقشات کا فتح باب کرتے ہیں ان سے ہر خاص و عام اچھی طرح واقف ہے جاہلیت میں اسی سود کی بدولت خونریز لڑائیاں تک ہوئی ہیں۔

ربوٰ کی طرح قمار بھی تمدن کے لیے مہلک اور غارت گر ہے۔ تعاون اور تراضی دونوں کی روح اس میں مفقود ہوتی ہے اور ان کے بجائے طمع، حرص، خودغرضی، زرپرستی، جہل اور تمنائے باطل کے رذیل محرکات جو تمدن کے مصالح اور دنیا بسر کرنے کے پسندیدہ اطوار اور ضروری وسائل کو تاراج کر دیتے ہیں، اسکی تہ میں کام کرتے ہیں، اور پھر جھگڑے لڑائی اور قطع رحمی کے جو لازمی نتائج معرضِ وجود میں آتے ہیں ان کے بیان کرنے کی شاید کوئی حاجت نہ ہوگی۔

کسب معاش کے لیے ان دونوں چیزوں کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا گیا ہے حتیٰ کہ لین دین کی جن صورتوں میں سود

یا جوئے کا خفیف سا شبہ بھی موجود ہو اُن سے بھی حکماً روک دیا گیا ہے۔ مثلاً بیع مزابنہ[1]، بیع محاقلہ[2]، بیع ملامسہ[3]، بیع منابذہ[4]، بیع حصاۃ[5] وغیرہ۔ نیز خشک کھجوروں کی بیع تر کھجوروں کے ساتھ اور کھجوروں کے ایسے ڈھیر کی بیع جس کا پیمانہ معلوم و متعین نہ ہو۔ ان تمام بیوع کو ناجائز کر دیا گیا کیونکہ ان کے اندر جوے کی روح موجود تھی۔

خرید و فروخت کے قوانین شریعت میں کاروبار کے جن طریقوں کی ممانعت کی گئی ہے، ان پر جب ہم مجموعی نظر ڈالتے ہیں، تو اصولی حیثیت سے ہم کو حسب ذیل اسباب ممانعت کا پتہ چلتا ہے:۔

(۱) ایسی چیزوں کی خرید و فروخت ممنوع ہے جو بجائے خود اسلامی قانون میں حرام ہیں اور جن کا استعمال عموماً معصیت ہی کے کاموں میں ہوتا ہے۔ مثلاً شراب، طنبور اور مجسمے وغیرہ کیونکہ ان اشیاء کی خرید و فروخت کی رسم جاری کر دینے کا لازمی انجام یہی ہے ــــ اگر ارادی طور پر نہیں تو کم سے کم بلا ارادہ ہی سہی ــــ کہ لوگوں کو اُن معاصی کی ترغیب دی جائے جو ان کے استعمال کا ناگزیر نتیجہ ہیں۔ بخلاف اس کے اگر سرے سے ان چیزوں کا لین دین ہی ممنوع ٹھیرا دیا جائے تو گویا بالواسطہ ان مفاسد کا قلع قمع کر دیا گیا اور لوگوں کو ان سے بچنے کی سہولت بہم پہنچا دی گئی۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور اصنام کی بیع و شراء کو حرام کر دیا ہے"۔

ایک اور ارشاد میں آپ نے غیر مبہم الفاظ میں اس قاعدہ کلیہ کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

ان اللہ اذا حرم شیئاً حرم ثمنہ — جب اللہ تعالیٰ کسی شے کو حرام کرتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام کر دیتا ہے۔

---

[1] درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو توڑی ہوئی کھجوروں کی ایک خاص مقدار کے عوض بیچنا۔

[2] گیہوں کی فصل کو گیہوں کے عوض فروخت کرنا۔

[3] بیع ملامسہ کی شکل یہ ہوتی تھی کہ ایک شخص کہتا تھا اگر میں تیرا کپڑا چھو دوں تو فلاں چیز کی بیع میرے نام ہو گئی۔

[4] یعنی مشتری آنکھ بند کر کے اپنا کپڑا پھینکے اور کہے کہ جس چیز یا گلہ میں سے جس جانور پر جا کر پڑے وہ اتنے دام میں میرا ہو جائیگا۔

[5] بیع حصاۃ بھی بیع منابذہ کی طرح ہوتی تھی فرق صرف یہ تھا کہ اس میں کپڑے کے بجائے کنکری پھینکتے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مہر البغی خبیث (زانیہ کی اجرت یعنی زنا کی فیس حرام ہے)
اور یہی حکم آپ نے کاہن کی اجرت اور مغنیہ کی کمائی کے بارے میں بھی دیا ہے۔ کیونکہ ان تمام اجرتوں میں یہی علت موجود ہے
یعنی ارتکاب معصیت کی ترغیب و ترویج۔ شراب کے بارے میں تو آنحضور صلعم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ "شراب بنانے والے،
شراب پینے والے، شراب ڈھونے والے اور شراب رکھنے والے سب پر لعنت ہو" کیونکہ ارتکاب معصیت جس طرح
معصیت ہے، ارتکاب معصیت میں امداد کرنا اور سہولت بہم پہنچانا بھی معصیت ہے۔

(۲) نجاست مثلاً مردار، خون، جانوروں کا فضلہ اور دیگر گندی چیزیں نہایت مکروہ اور شیاطین سے بہت مشابہ
پیدا کرنے والی ہیں، بخلاف اس کے اسلام کی فطرت لطافت اور پاکیزگی چاہتی ہے، اور پاکیزگی کا قائم کرنا نبی آخر الزماں کے
مقاصد بعثت میں سے ہے اسلیے شرع نے تمام نجاستوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے۔ اور ان کو ذریعہ معاش بنانے سے
روک دیا ہے تاکہ انسان انکا خوگر نہ ہونے پائے۔ چنانچہ مردار کی خرید و فروخت کو حرام کر دیا گیا، حجامت (پچھنے لگانے)
کی اجرت لینے سے منع کر دیا گیا اور نر جانوروں کو مادہ سے جفتی کھانے کے لیے کرایہ پر دینے کو ناجائز ٹھیرا دیا گیا۔
کیونکہ ان ذرائع سے جو روزی میسر ہوتی ہے وہ نجاست کے دروازہ سے گذر کر آتی ہے۔

(۳) ایسے معاملات کو ناجائز قرار دیا گیا ہے جو نزاع (Litigation) کا دروازہ فطرۃً کھولتے ہوں،
مثلاً یہ کہ عوضین (قیمت اور مال) کا تعین اور تشخص نہ ہو۔ یا بیع در بیع[1] کی شکل ہو۔ یا خریدار نے مال کو نہ دیکھا ہو اور
بغیر دیکھے ہوئے یہ یقین نہ کیا جا سکتا ہو کہ جو مال اسے دیا جائیگا وہ اس پر راضی بھی ہوگا یا نہیں۔ یا بیع میں کوئی ایسی شرط[2]
ہو جو بعد میں چل کر قیل و قال کی موجب ہو۔

اسی اصول پر شارع علیہ السلام نے بیع مضامین، (ان آئندہ پیدا ہونے والے بچوں کی بیع جو ابھی نر جانور
کی پشت میں ہیں) اور بیع ملاقیح (جو بچے ابھی بطن مادر میں ہیں) اور بیع حبل الحبلہ (جس بچے کی ماں ہی ابھی حم

---

[1] مثلاً خریدار بائع سے ایک چیز خریدتے وقت یہ قید لگا دے کہ میں اس چیز کو اتنے روپوں میں خریدتا ہوں بشرطیکہ فلاں چیز تم مجھے اتنے روپے میں دو۔
[2] مثلاً بیع مشروط کی ایک صورت یہ ہے کہ بائع اپنی چیز بیچتے وقت یہ شرط لگا دے کہ اگر مشتری کبھی اسے بیچنے کا قصد کرے تو میں لینے کا زیادہ حقدار ہونگا۔

مادر میں ہو) سے[1] روکا ہے، کیونکہ شے فروختنی کا ابھی وجود ہی نہیں تو اس کا تعین کس طرح ممکن ہے۔ اسی طرح ایسے معاملہ کو ناجائز کر دیا گیا ہے جس میں اصل چیز اور اسکی قیمت دونوں غیر موجود اور موخر ہوں۔ استثنار غیر معین کا بھی یہی حکم ہے۔ اس بیع کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع معاملہ کرتے وقت مثلاً یہ کہے کہ اتنے روپیوں میں میں تھوڑا سا چھوڑکر اپنا یہ دس من جو تمہیں دیدونگا۔ اس "تھوڑے سے" کا عدم تعین فریقین کے درمیان وجہ نزاع بن سکتا ہے۔ لیکن اس کلیہ کو بہت زیادہ عام نہیں کیا جاسکتا یعنی ہر جزوی امر کا عدم تعین بیع کو فاسد نہیں کر دیتا کیونکہ عادۃً اور رواجاً معاملات بیع کے متعلق بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں جنکی توضیح اور تعیین نہیں کی جاتی اور نہ کی جاسکتی ہے۔ مفسد بیع صرف وہ عدم تعین ہے جو موجب نزاع بن سکے۔

ایسے معاملات بھی اسی بنا پر ناجائز ہیں جن میں معاملہ تو ایک چیز کا ہو رہا ہو مگر دراصل وہ مقصود بالذات نہ ہو بلکہ اس کے ضمن میں در پردہ کوئی اور ہی معاملہ پیش نظر ہو۔ ایسے معاملات سخت خصومت انگیز اور ایسے پیچیدہ ہوجاتے ہیں جن کا کوئی حل ملنا دشوار ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ بیع مقصود بالذات تو ہوتی نہیں، اسے محض ایک دوسرے مقصد کے لیے بہانہ بنایا جاتا ہے، اور ایک فریق جب دیکھتا ہے کہ جو اصل مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہوتا تو وہ معاملہ بیع کی تکمیل سے جی چراتا ہے اور دوسرا فریق طے شدہ بات کو پورا کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی بنا پر شارع نے ایسے معاملات کی سرے سے ممانعت فرمادی ہے۔ رسول اللہ صلعم کا ارشاد ہے کہ:

لا یحل بیع وسلف ولا شرطان فی بیع — ایک ہی ساتھ بیع اور بیع سلف دونوں کا معاملہ کرنا یا کسی معاملہ بیع میں دو شرطوں کی قید لگانا جائز نہیں۔

بیع سلف کے معنی ہیں کسی چیز کی جو آیندہ تیار ہونے والی ہو پیشگی نقد روپیہ دے کر بیع کرا لینا۔ اور دو شرطوں

---

[1] بیع کے یہ سارے طریقے زمانہ جاہلیت میں رائج تھے۔ کوئی اصیل و نجیب اونٹ کو دیکھتا تو قبل اس کے کہ اس کے نطفہ سے کوئی بچہ رحم مادر میں وجود پذیر ہو، مالک سے یہ معاملہ کر لیتا کہ اس سے جو بچہ ہوگا اتنی قیمت میں میں لے لونگا اسی طرح ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے سے قبل ہی بچے کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی تھی اور بسا اوقات ماں بھی عالم وجود میں آئی نہ ہوتی۔

کا مفہوم یہ ہے کہ بائع ایک تو اس چیز کے حقوق بیع اپنے لیے مخصوص کرالے، اور دوسرے کوئی اور خارجی شرط لگا دے مثلاً اگر اس چیز کو تمہیں کبھی بیچنا منظور ہو تو میرے ہی ہاتھ بیچنا، نیز میں اس شرط کے ساتھ تمہیں یہ چیز بیچ رہا ہوں کہ اپنی فلاں چیز مجھے ہبہ کر دو یا فلاں کے یہاں میری سفارش کر دو۔

اسی قاعدہ پر ان معاملات کی بھی ممانعت کی گئی ہے جن میں عوضین میں سے کسی ایک کا اختیار بیع کرنے والے کے ہاتھ میں نہ ہو، مثلاً ثمن (قیمت) خریدار کے قبضہ میں نہ ہو، یا چیز بائع کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ فی الحال عملاً دوسرے کے اختیار میں ہو اور اس کا محض نظری حق اس شے پر پہنچتا ہو، یا ابھی محل نزاع ہو۔ ایسی صورت میں بہت ممکن ہے کہ ایک قضیہ کے اندر دوسرا قضیہ پیدا ہو جائے یا فریق مخالف کو دھوکہ اور نقصان پہنچ جائے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک کوئی چیز تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تمہیں اطمینان نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمہیں مل ہی جائیگی۔ لہٰذا اگر ان حالات میں بیع منعقد ہو گئی اور مشتری نے قبضہ کا مطالبہ کر دیا تو بائع کے لیے اس کے سوا کیا چارہ کار ہو گا کہ ادھر ادھر دوڑتا پھرے اور اس طرح مناقشات کی گرم بازاری کا سامان پیدا کرے۔ اسی مفسدہ کا قلع قمع کرنے کی خاطر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو چیز تمہارے اپنے ہاتھوں میں نہ ہو اس کی بیع نہ کرو" دوسرے ارشاد میں ہے کہ "جو کوئی گیہوں خریدے اس وقت تک بیع نہ کرے جب تک کہ اس کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیتا"۔ یہ حکم صرف گیہوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ عام ہے۔ نیز آپ نے ایسی شے کی بیع سے منع کر دیا ہے جس کے متعلق بائع کو یقین کامل نہ ہو کہ آیا وہ میرے ہاں موجود بھی ہے یا نہیں یا میں اسے پا سکتا ہوں یا نہیں۔

اسی طرح شارع نے چن چن کر ان معاملات کو حرام کیا ہے جو عموماً نزاع میں پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً درخت کے کچے پھلوں کی بیع کا عرب میں عام رواج تھا۔ اس کے متعلق حضرت زید بن ثابت رضی فرماتے ہیں کہ لوگ باہم ایسی خرید و فروخت کرتے تھے لیکن جب آفات سماوی پھلوں کو نقصان پہنچا دیتیں تو آپس میں لڑائی تکرار کرنے لگتے۔ مشتری قیمت کی ادائیگی کے خلاف حجت پیش کرتا کہ پھل پکنے سے قبل ہی خراب اور سڑ گل گئے۔ اس متوقع نزاع کے انسداد کے لیے آنحضرت صلعم نے ممانعت فرما دی کہ "درخت پر لگے ہوئے پھل اس وقت تک نہ بیچے جائیں جب تک کہ وہ قابل

انتفاع نہ ہو جائیں" الآیہ کہ مشتری اُسی وقت پھلوں کو توڑ لے۔ اس ممانعت کے بعد آپ نے فرمایا:

ارأیت اذا منع اللہ الثمرۃ بما یاخذ احدکم مال اخیہ — سوچو کہ جب اللہ تعالیٰ نے پھلوں کو نیست و نابود کر دیا تو پھر کوئی کس شے کے عوض اپنے بھائی کا مال (پھلوں کی قیمت) لیتا ہے؟

یعنی اس طرح کی بیع میں ایک قسم کا دھوکا پوشیدہ رہتا ہے، کیونکہ پھلوں کے ضائع ہو جانے کا خطرہ بہر حال موجود ہے۔ اگر وہ واقعی ضائع ہو جائیں تو خریدار غریب کو قیمت تو ادا کرنی پڑے گی اور اس کے عوض اسے کچھ بھی ہاتھ نہ آئیگا۔

(۴) خرید و فروخت کے معاملات میں مسابقت (Competition) کی ایسی صورتوں کو روکا گیا ہے جن سے لوگوں کے درمیان حسد اور مخالفت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، اور جن کا نتیجہ یہ ہو کہ کچھ لوگ پیش قدمی کر کے دوسرے لوگوں کو اکتساب رزق سے محروم کر دیں۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

لا تلقوا الرکبان لبیع و لا یبیع بعضکم علی بیع بعض و لا یسم الرجل علی سوم اخیہ و لا تناجشوا و لا یبیع حاضر لباد — آبادی سے نکل کر تجاروں کو راستے میں نہ جا پکڑو، اور ایک شخص دوسرے شخص کی بیع میں مداخلت کر کے اپنی بیع نہ کرے۔ اور ایک شخص دوسرے کی بولی پر بولی نہ دے، اور محض دوسروں کو خریداری سے روکنے کے لیے بولی نہ بڑھائی جائے۔ اور شہر والا گاؤں والے کی طرف سے بیع کا مختار نہ بنے۔

ان ہدایات میں سے موخر الذکر ہدایت کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں والوں کو براہِ راست شہر میں آ کر لوگوں کے ہاتھ مال فروخت کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ آڑھتیے جو اُن کا مال لے کر نسبتہً زیادہ قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں یہ عام باشندوں کے لیے تنگی کا موجب ہے، اور اس سے خود گاؤں والوں کا بھی نقصان ہے، کیونکہ وہ زیادہ فائدے کا لالچ کر کے آڑھتیے کے جال میں پھنس جاتے ہیں، اور پھر اس کے پھندے سے اُن کا نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ نیز یہ کاروبار تمدن کی ترقی کے لیے بھی مضر ہے کیونکہ

گاؤں والوں کا بار بار مال لے کر آنا اور تھوڑا کمانا اس سے بہتر ہے کہ وہ زیادہ نفع کی خاطر مال کو روک کر رکھیں۔

(۵) ایسے طریقوں سے نفع کمانے کی کوشش بھی حرام کر دی گئی ہے جو عامۃ الناس کے لیے موجب نقصان و تکلیف ہوں، مثلاً غلے کو قیمتیں گراں کرنے کی خاطر جمع کرنا اور روک رکھنا کہ یہ خود غرضانہ نفع طلبی ہے اور اس سے تمدن میں خرابی واقع ہوتی ہے۔ اسی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من احتکر فھو خاطئ (جس نے احتکار کیا وہ گناہ گار ہے)۔ اور الجالب مرزوق والمحتکر ملعون (کسب کرنے والے کو رزق ملتا ہے اور احتکار کرنے والے کے حصہ میں لعنت آتی ہے)

(۶) ایسے تمام معاملات ممنوع ہیں جن میں ایک شخص دوسرے شخص کو دھوکہ دے کر نفع کمانے کی کوشش کرے، مثلاً اپنے مال کا عیب چھپائے، یا اس کا مال جتنا اچھا نہیں ہے اتنا ظاہر کرے۔ اسی سلسلہ میں یہ حدیث ہے کہ

لا تصروا الابل والغنم فمن ابتاعھا	اونٹنی یا بکری کو بیچتے وقت اس کے تھنوں میں دودھ
بعد ذلک فھو بخیر النظرین بعد ان یحلبھا	جمع کر کے نہ رکھو کہ خریدار اس کو زیادہ دودھ والی سمجھے۔
ان رضیھا امسکھا وان سخطھا ردھا و	اگر ایسا کیا جائے تو خریدار کو اختیار ہے کہ تین دن رکھ کر اسے
صاعا من تمر ویروی صاعا من طعام	دیکھے اور پسند نہ آئے تو واپس کر دے۔ لیکن واپس
لا سمراء	کرتے وقت وہ ساتھ ہی ساڑھے تین سیر کھجوریں بھی اس

دودھ کے عوض دیدے جو اس نے نچوڑا ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ ساڑھے تین سیر غلہ دے، لیکن وہ زیادہ قیمتی غلہ نہ ہو۔ مثلاً شامی گیہوں (کہ وہ حجاز میں زیادہ قیمتی ہوتا تھا)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصنوعی طور پر مال کو اچھا بنانے کی بھی نہی فرمائی ہے۔ ایک شخص نے کھجوروں کو پانی سے تر کیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اس سے فرمایا - افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس؟ من غش فلیس منی (کیا تو نے اس کو اوپر سے تر نہیں کیا ہے کہ لوگ دیکھ کر دھوکا کھائیں؟ جو شخص دھوکہ بازی کرے اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں)

(۷) ایسی چیزوں کی بیع بھی حرام ہے جن کو اللہ نے سب انسانوں کے لیے مباح کیا ہے- مثلاً جو پانی قدرتی طور پر بہ رہا ہو اور خود لوگوں تک پہنچنے والا ہو اسکو کوئی شخص روک لے اور قیمت لے کر دوسروں کے لیے چھوڑے- یہ اللہ کے مال میں بغیر کسی حق کے تصرف کرنا ہے اور اس میں بندگان خدا کی ضرر رسانی ہے- چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع فضل الماء (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرورت سے زائد پانی کو قیمتہً دینے کی ممانعت فرمائی ہے)- اسی طرح قدرتی چراگاہ میں جانوروں کے چرنے پر اجرت عائد کرنا بھی ممنوع ہے- چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "جو شخص ایسا کریگا، اللہ بھی اس سے کہیگا کہ میں تجھ کو اپنے فضل سے اسی طرح محروم کرتا ہوں جس طرح تونے لوگوں کو اس فضل سے محروم کیا جس کے بنانے میں تیرا کوئی حصہ نہ تھا" ایک اور حدیث میں ہے کہ "پانی اور چارہ اور آگ، یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں سب مسلمان شریک ہیں"

(باقی)

تنزیل و تاویل

امثال القرآن

(۴)

از جناب مولوی محمد ایوب صاحب جیراجپوری

(۱۳) دنیا پرست کا قلب حق کو حق جان لینے کے بعد بھی کس طرح اس کی پیروی سے بھاگتا ہے، اسکی تمثیل:-

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ	اے پیغمبر ان لوگوں کو اس شخص کی خبر پڑھ کر سناؤ
آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ	جسے ہم نے اپنی آیات دی تھیں (لیکن اس نے ان پر عمل
مِنَ الْغَاوِينَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا	نہیں کیا) اور انکی پیروی سے بچ کر نکل بھاگا، پھر شیطان نے
وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ	اسے آلیا اور وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے
كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ	تو انہی آیات کے ذریعہ سے اس کو اونچا اٹھاتے لیکن وہ تو
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ	دنیا سے چمٹ گیا اور اپنی خواہشِ نفس کے پیچھے لگ گیا۔
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (اعراف-۲۲)	پس اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگر اسے جھڑکو مارو

تو بھی، اور اگر خاموش رہکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تو بھی زبان باہر لٹکائے رہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی۔ پس یہ قصے اپنے مخاطبین کو سناؤ تاکہ وہ غور کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے علم ہدایت رکھنے والے دنیا پرست کی مثال کتے سے دی ہے۔ دونوں کی کیفیات کا تجزیہ کر کے دیکھو کہ دونوں کی فطرت میں کس قدر یکسانی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو اپنا ہدایت نامہ (کتاب) دیتا

ہے، اسے علم کی بخشش سے نوازتا ہے، لیکن وہ شکر بجالا کر اس پر عمل کرنے کے بجائے اسے پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور عمل کا ہر قدم خواہشِ نفس کی پیروی میں اٹھاتا ہے یعنی خدا کی نارضامندی کو اس کی رضا پر، مخلوق کو خالق پر اور چند روزہ دنیائے دنی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔ کتے کی جبلت میں اس کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ اپنے پیٹ کے سوا دنیا کی کسی چیز سے اسے سروکار نہیں۔ حرص و آز کا اس کی فطرت پر اس قدر کامل غلبہ ہے کہ چلتے پھرتے اس کی ناک ہر حال زمین سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جائے اور اسے اپنی آتش معدہ کی تسکین کا موقع مل جائے۔ جب اسے پتھر سے مارا جاتا ہے تب بھی اس کی یہ توقع دور نہیں ہوتی کہ شاید یہ پتھر کے بجائے نوالہ ہو۔ پیٹ کا بندہ لپک کر اسکو بھی ایک دفعہ تو دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ گویا اس کمبخت کے ذہن میں پیٹ اور کھانے کے سوا کسی اور چیز کا تصور کبھی آتا ہی نہیں۔ جس چیز کو دیکھتا ہے پیٹ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اسی حرص کا اثر ہے کہ جب ایک کتا کوئی بہت بڑی مردہ لاش پا جاتا ہے جو صدہا کتوں کے کھانے کے لیے کافی ہوتی ہے تب بھی وہ کسی دوسرے کتے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا، اس میں شریک نہیں کرتا اور اگر کوئی دوسرا آن موجود ہوتا ہے تو بھونکنا اور کاٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ بھاگ جائے۔ پھر اس دنائت کے ساتھ ساتھ کس قدر ناپاک طبع اور گندہ فطرت ہوتا ہے کہ تازہ اور صاف کھانے کے مقابلہ میں مردار اور بدبودار اشیاء کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اپنے جسم کے سارے اعضاء کو چھوڑ کر بس اپنی شرمگاہ سے دلچسپی رکھتا ہے اور بار بار اُسی کو سونگھتا رہتا ہے۔

کتے کی ان فطری خصوصیات کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ جو شخص کتاب الٰہی کی ہدایت سے واقف ہو جانے اور اس کی صداقت کو جان لینے کے بعد عملاً اسکے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اسکی حالت کتے سے کس قدر مشابہ ہے۔ اپنے علم اور اقرار کے خلاف عمل کرنے پر جو چیز اسے مجبور کرتی ہے وہ اسکی حد سے بڑھی ہوئی نفس پرستی کے سوا اور کیا ہے؟ جب وہ پیٹ اور شرمگاہ کا غلام بن جاتا ہے تب ہی تو خدا کو خدا ماننے کے باوجود اسکی بندگی سے انکار کرتا ہے۔ اسکے نفس میں کچھ عرصہ تک ایک کشمکش رہتی ہے۔ ایک طرف اس کا علم کھینچتا ہے اور دوسری طرف اسکی خواہشات کھینچتی ہیں۔ آخر کار جب وہ علم کی رسی توڑ کر خواہشات کی طرف ٹوٹ پڑتا ہے، تو اسکی حالت بالکل

وہی ہوتی ہے جو اوپر کتے کی حالت بیان کی گئی ہے۔ پھر اس کو حلال سے زیادہ حرام کے ساتھ رغبت ہوتی ہے پھر اسکے دل اور دماغ کی جگہ بھی معدہ ہی لے لیتا ہے۔ پھر وہ دنیا کی ہر چیز کو پیٹ کی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر اسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ چار روٹیوں پر اس سے جس چیز کی چاہو قربانی لے لو۔ پھر وہ نوالے کی توقع پر ہر ذلت برداشت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور پیٹ کے بعد اگر کوئی چیز اسکی دلچسپیوں کا مرکز ہوتی ہے تو وہ اسکی شرمگاہ ہے۔ اس کا بس نہیں چلتا کہ ہمہ تن شرمگاہ بن کر رہ جائے!

ابن جریج کا قول ہے کہ کتا منقطع القلب ہوتا ہے، اسکے اندر دل نہیں ہوتا۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سینہ میں دل نہیں ہوتا جو اسے صبر اور وقار پر آمادہ رکھ سکے اور حرص اور بے صبری کی اس کھلی نشانی (یعنی زبان نکالنے) سے باز رکھ سکے۔ ایسا ہی وہ بدبخت انسان بھی ہے جو خدا کی کتاب سے کٹ جاتا ہے۔ وہ بھی اس قلب سے محروم ہوتا ہے جو اسے قناعت اور ضبط نفس پر آمادہ کر سکے۔ اور دنیا کی غلاظتوں میں روح کو تھڑنے سے روک سکے۔ بے صبری اور عشق دنیا کا وفور دونوں کی مشترک خاصیت ہے۔ وہ اس وجہ سے دنیا پر ٹوٹا پڑتا ہے کہ اس کی طبیعت دنیا کے بارے میں غیر معمولی بے صبر اور غیر قانع واقع ہوئی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہر آن زبان نکالے رہتا ہے کہ حرص اور لالچ کی آگ اس کے کلیجہ میں ہر دم جلتی رہتی ہے۔ کتے کی زبان لٹکنے سے باز نہ آئیگی خواہ تم اسے مار پیٹ کر زبان منہ میں رکھنے پر مجبور کرو، یا اسکے حال پر چھوڑ دو۔ اسی طرح جو انسان کتے کی سی حالت میں مبتلا ہو اسکو خواہ تم وعظ و نصیحت کے ذریعہ خدا اور آخرت کا خوف دلاؤ یا خاموش رہو، ہر حال میں اسکا دل دنیا ہی میں پھنسا رہیگا۔

حضرت ابن عباسؓ اس تشبیہ کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اگر تم اس کو حکمت کی باتیں بتاؤ تو وہ اس کا تحمل نہ کر سکیگا، اور اگر اسے یونہی اسکے حال پر چھوڑ دو تو خیر اور راستی کی توفیق نہ پائیگا۔

امام حسن فرماتے ہیں کہ یہ منافق کی مثال ہے جو شاہراہ حق پر کسی طرح ثابت قدم نہیں رہ سکتا، خواہ اس کو حق کی دعوت دی جائے یا نہ۔

ابو محمد ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ ہر جانور بھوک یا پیاس کی شدت سے بدحواس ہو کر زبان نکالتا ہے۔ مگر کتے

کا حال سب سے مختلف ہے - یہ آرام، تکلیف، تندرستی، بیماری، تشنگی، سیرابی غرض ہر حال میں زبان نکالے رہتا ہے - اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال کتے ہی سے دی جو آیات الٰہی کو جانتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہیں اور پھر عملاً ان کی تکذیب کرتا ہے - اگر اس کو نصیحت کی جائے تب بھی وہ گمرہی کی دلدل میں پھنسا رہیگا اور اگر نصیحت نہ کی جائے تب بھی - چنانچہ دوسری جگہ ایک آیت میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا
يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ
اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ -

اور اگر تم ان لوگوں کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ
تمہاری پیروی نہ کرینگے - تمہارے لیے یکساں ہے
خواہ انھیں حق کی دعوت دو یا خاموش رہو -

اب اس مثل کے لیے جو الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں ان کے اسرار و معانی پر ایک نگاہ ڈالو - سب سے پہلے اٰتَيْنَاهُ اٰيَاتِنَا کو دیکھو - خدا کہتا ہے کہ ہم نے خاص طور پر اس کو اپنی آیات دیں، جو درحقیقت سب سے بڑی نعمت ہیں - اس بخشش نعمت کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس بخشش کی قدر و منزلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے - ورنہ اگر معمولی سی نعمت ہوتی تو اُوْتِیَ (اسکو آیات دی گئی تھیں) کہہ دیا جاتا -

پھر فرمایا فَانْسَلَخَ مِنْهَا - یعنی ان آیات کے احاطہ اور اقتدار سے اس طرح نکل بھاگا جس طرح سانپ اپنی کینچلی چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے یا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچی جائے اور وہ گوشت سے الگ ہو جائے - دیکھو پہلے جملہ کی طرح یہاں خدا نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ ہم نے اسے اپنی آیات سے دور کر دیا، کیونکہ یہ تو دراصل اسی بدبخت کا فعل ہے اور اپنی ہوا پرستی کی وجہ سے وہ خود ہی اس محرومی کا سبب بنا ہے -

اس کے بعد آتا ہے "فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ" یعنی شیطان نے اسے پالیا - "اتباع" کے معنی یہاں پا لینے اور پکڑ لینے کے ہیں - چنانچہ قوم فرعون کے بنی اسرائیل کو پا لینے کو اللہ تعالیٰ نے "اتباع" ہی کے لفظ سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ" (صبح کے وقت انھوں نے بنی اسرائیل کو جا لیا) - شیطان کا حملہ اس وقت اس پر کارگر ہوا جب وہ آیات الٰہی کو پس پشت ڈال چکا تھا - اس سے قبل وہ ان آیات کے مضبوط حصار میں مامون و مصئون تھا اور کسی طرف

سے بھی شیطان اس پر قابو نہ پا سکتا تھا الاّ آنکہ وہ کبھی غافل رہا ہو اور اچانک شیطانی فریب کا چند لمحوں کے لیے شکار ہو گیا ہو۔ لیکن جب اس نے آیات الٰہی کے اس حصار کو خود ہی توڑ کر پھینک دیا اور اس سے آزاد ہو گیا تو شیطان نے اپنی کمین گاہ سے جھپٹ کر اسے اس طرح اپنے پنجوں میں داب لیا جس طرح شیر اپنے شکار کو داب لیتا ہے۔ انجام کار وہ ان گمراہوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا (فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ) جو حق کو پہچان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں اور علم ہدایت رکھتے ہوئے اس کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے یعنی علمائے سوء۔

پھر فرمایا کہ "اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعہ سے اسکو اٹھا کر بلندیوں پر لے جاتے" (وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا)۔ یہاں خدا اپنا ایک قانون بیان کر رہا ہے کہ محض علم، خواہ وہ کیسا ہی حقیقی اور عظیم کیوں نہ ہو خدا کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ قدر و منزلت کی چیز دراصل اتباع حق اور پروردگار کی رضا جوئی ہے۔ اور علم کی قدر بھی اسی لیے ہے کہ وہ عمل صحیح کا ذریعہ ہے۔ اگر علم ہو اور پھر اسکے خلاف عمل کیا جائے تو یہ انسان کو اور زیادہ غضب کا مستحق بنا دیتا ہے۔

ضمناً ایک نکتہ اور بھی اس انداز بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا اپنے علم کے ذریعہ سے بلند مرتبے پر پہنچنا حقیقت میں اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے توفیق نہ ملے تو کوئی شخص اپنے علم کے بل بوتے پر اس نعمت کو حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ مجرد علم کوئی وزن نہیں رکھتا۔ خود علم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی نیچے کو اونچا کر دے۔ بلندی پر پہنچنے کے لیے علم کے ساتھ دوسرے بہت سے اسباب کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جو اگر مساعد نہ ہوں تو علم کے باوجود آدمی پست حال رہتا ہے۔ اور اسباب کا مساعد ہونا اللہ ہی کی توفیق پر منحصر ہے۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ "لَرَفَعْنَاهُ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع کفر ہے نہ کہ وہ شخص جسکی تمثیل بیان کی گئی ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ اگر ہم چاہتے تو اپنی دی ہوئی آیات کے ذریعہ اس شخص کے اندر سے کفر کو نکال دیتے۔ امام مجاہدؒ اور عطاءؒ اسی طرف گئے ہیں۔ اگرچہ یہ خیال بھی اپنی جگہ صحیح ہے لیکن پہلے

جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے وہی اس آیت کا اصلی مفہوم ہے اور یہ دوسرا مفہوم اس کے لوازم میں سے ہے۔ لہٰذا دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، سلف کی تفسیر کا یہ بھی ایک اصول اور طریقہ تھا کہ وہ بسا اوقات آیتوں کی حقیقی مراد بیان کرنے کے بجائے اس کے لوازم اور مقتضیات بیان کر دیا کرتے تھے۔ جو لوگ ان کے اس طریقہ سے ناواقف ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم ہی یہی ہے۔

"اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" اس فقرے کی تفسیر میں بہت سے اقوال نقل ہوئے ہیں۔ امام مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ "وہ بے فکر اور مطمئن ہو گیا" سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ "دنیا کی طرف جھک گیا" مقاتلؒ کے الفاظ ہیں کہ "وہ دنیا کا گرویدہ ہو گیا" لیکن تعدد اقوال محض الفاظ تک ہے ورنہ سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

"وَاتَّبَعَ هَوَاهُ" کے مفہوم میں بھی اسی طرح کے مختلف اقوال مذکور ہیں۔ کلبیؒ فرماتے ہیں کہ "معالی امور کو ترک کر کے رذیل مقاصد کے پیچھے پڑ گیا" ابو روق کہتے ہیں کہ "دنیا کو آخرت پر ترجیح دی" عطاءؒ کا قول ہے کہ "دنیا کا مرید ہو گیا اور اپنے شیطان کی پیروی کی" ابن زید کا خیال ہے کہ یہاں "ہوا" سے مراد اس کا وہ میلان ہے جو اسے حضرت موسیٰؑ کے خلاف نبرد آزما ہونے والی کافر قوم کے ساتھ تھا۔ یمان کہتے ہیں کہ "ہوا" سے مراد زن مریدی ہے کیونکہ جس شخص کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اسکی بیوی ہی نے دنیا پرستی کی طرف اسے راغب کیا تھا۔

(۱۴) کتاب الٰہی پر عمل چھوڑ دینے والوں کی مثال:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (جمعہ۔ ۱)

جن لوگوں کو توراۃ دی گئی پھر انھوں نے اسے اٹھانے سے (اس کے احکام پر عمل کرنے سے) عملاً انکار کر دیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے ہیں ان کی مثال بہت ہی بری ہے۔ اور اللہ راہِ راست سے تجاوز کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں ان بدبخت لوگوں کی مثال بیان کی گئی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب دی تاکہ وہ اس پر ایمان

لائیں، اس میں غور و تدبر کریں، اس کے فرمان کے مطابق عمل کریں، لیکن انھوں نے اس عطیۂ الٰہی کے ساتھ اعتناء نہ کیا، اسکی تعلیمات کی عملاً مخالفت کی، اور اس کی آیات کو طوطے کی طرح پڑھ لینے کے سوا ان سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ وہ جب کتاب الٰہی کے الفاظ زبان سے دہرا لیتے تو انکی تلاوت بس حلق سے اوپر ہی اوپر رہتی۔ دل پر ایسا قفل چڑھا رہتا کہ کتاب کی ہدایت کا کوئی اثر اندر تک نہ پہنچنے پاتا۔ اس طرح فہم و تدبر اور عمل و اتباع کے بغیر محض کتاب کے الفاظ دہرانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس گدھے سے تشبیہ دی ہے جس کی پشت پر کتابوں کا انبار لدا ہوا ہوتا ہے اور اسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا ہے۔ اس کا واسطہ ان کتابوں سے بس اتنا ہی ہے کہ وہ انہیں لادے پھر رہا ہے۔

یہ تمثیل اگرچہ یہود کی بیان کی گئی ہے، لیکن معنوی حیثیت سے یہ ان لوگوں پر بھی چسپاں ہوتی ہے جنھیں قرآن دیا گیا ہے مگر وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، نہ اس کے حقوق ادا کرتے ہیں، نہ اس کو قانون کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ ان کا اس کے ساتھ کمال اعتناء صرف اس قدر ہے کہ حریر و دیبا کے خوشنما جزدانوں میں اسے لپیٹ کر طاقچوں پر رکھ دیا جائے اور بس تبرک کے لیے اس کی تلاوت کر لی جائے۔

(۱۵) مشرکین کی حسرتناک اور کس مپرسانہ ہلاکت کی تمثیل:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ
وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ
مُشْرِكِينَ بِهِ وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ
فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ
أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ
(حج - ۴)

پس بت پرستی کی نجاست سے دور رہو اور دروغ گوئی سے بچتے رہو۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے ہو رہو اس کے ساتھ تو کسی کو شریک نہ کرو۔ اور جو خدائے واحد کے ساتھ شرک کرتا ہے اسکی مثال ایسی ہے کہ گویا وہ آسمان سے گر پڑا۔ پھر یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا ہوا کسی دور دراز مقام پر لیجا کر ڈال دیگی۔

اس تمثیل پر غور کرو اور دیکھو کہ اللہ کے ساتھ اغیار کو شریک الوہیت کرنے والوں کے انجام اور حالات کی کیسی کامل تصویر ہے۔ اس تشبیہ میں دو پہلو ہو سکتے ہیں:

(۱) اسے تشبیہ مرکب مانا جائے - یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں باہمی مطابقت ان کے ہر ہر جزو کی حیثیت سے نہ ہو۔ اس صورت میں مشرک کی اس حالت کو، کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں ہلاکت کا ایسا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا ہے جس سے رہائی کی توقع ہی ناممکن ہے، اس شخص کے حال اور انجام سے مشابہت دینا مقصود ہوگا جو آسمان سے گر پڑا ہو اور فضا ہی سے پرندے لپک کر اس کی تکا بوٹی کرنے لگیں یا ہوا کے تیز و تند جھونکے اسے اڑا کر کسی دور دراز اور سنسان مقام پر ڈال دیں جہاں زندگی کی بقا و حفاظت کی کوئی شکل نہ ہو - پس جس طرح اس شخص کی ہلاکت یقینی اور ناگزیر ہے اور اسے اس ہلاکت سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا اسی طرح توحید کے رشتہ کو چھوڑ کر کوئی شخص ہلاکت سے مفر نہیں پا سکتا -

(۲) اسے تشبیہ مفرق مانا جائے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مطابقت ہوتی ہے - اس صورت میں خالص انسانیت کے مقام کو (جس کا فطری تقاضا خدائے واحد کی بندگی ہے، اور جس کی خلقی رفعت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مخلوق کے آگے سر نہ جھکایا جائے) آسمان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس سے اوپر بس اللہ ہے، اور سب کچھ اس کے نیچے ہے - جو شخص خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا الٰہ اور رب اور خداوند اور ان داتا اور مالک امر و نہی بناتا ہے، یا خداوندی میں دوسروں کو خدا کا شریک قرار دیتا ہے، اس کی حالت ایسی ہے کہ وہ گویا آسمان سے گر کر تحت الثریٰ کی طرف چلا آ رہا ہے - اب جو وہ اس پستی کی طرف چلا تو اس کے دو ہی انجام ہوں گے - یا تو وہ ان فاسق و ظالم حکمرانوں اور جھوٹے مذہبی پیشواؤں کے چنگل میں پھنس جائیگا جو اسکی بوٹیاں شکاری پرندوں کی طرح نوچ نوچ کر کھائینگے - یا پھر خود اپنی ہوائے نفس کے طوفان میں گھر جائیگا اور وہ اسے کہیں سے کہیں اڑائے لیے پھرےگی -

(۱۵) موحد اور مشرک کی تشبیہ:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ - (الزمر - ۳)	اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے کہ ایک شخص تو ایسا ہے جو بہت سے باہم مخالفت رکھنے والے آقاؤں کا غلام ہے، اور دوسرا ایسا شخص ہے جو کامل طور سے ایک ہی آقا کی ملک ہے - کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ (ہرگز نہیں)

ہر حمد کا مستحق صرف خدا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہاں مشرک اور موحد دونوں کی پوزیشن دکھلائی گئی ہے۔ مشرک اس غلام کی طرح ہے جس کی ملکیت میں بہت سے آقا شریک ہیں، اور لطف یہ ہے کہ ان آقاؤں میں بھی موافقت نہیں ہے بلکہ ہر وقت کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ ہر آقا اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور ان کی کشاکش میں اس غریب کا حال پتلا ہوا جاتا ہے۔ اسکے لیے ان سب آقاؤں کو بیک وقت راضی کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ ان سب کے تقاضے متضاد اور احکام متصادم ہیں۔ برعکس اس کے موحد، جو ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں، اس کشاکش سے محفوظ اور پورے امن میں ہے۔ اس کی حالت ایسے خادم کی سی ہے جو ایک ہی آقا کا خدمت گذار ہے اور اس کے مزاج اور اس کے احکام و مقاصد سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے اس کی خدمت اور اس کی رضا جوئی کا طریقہ اچھی طرح جانتا ہے، اس لیے ایک طرف تو اس کا مالک خوش رہتا ہے دوسری طرف وہ خود مختلف المزاج بہت سے آقاؤں کی خدمت و رضا جوئی کی کشمکش سے محفوظ رہتا ہے، اور اپنے واحد مالک کی ہر طرح کی عنایات کا مرکز بنا رہتا ہے۔ کیا یہ دونوں غلام برابر ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں ہو سکتے اور یقیناً نہیں ہو سکتے، تو پھر مشرک اور موحد کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں؟

رسائل و مسائل

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"

(۲)

(از جناب خان بہادر نواب محمد ذکاء اللہ خاں صاحب)

پیٹ اور روٹی کا سوال مولانا کو پنڈت جواہر لال نہرو سے یہ شکایت ہے کہ وہ روٹی کے مسئلہ کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کارل مارکس کے فلسفۂ تاریخ کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں۔ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو نے اس روٹی کے مسئلہ کو غیر ضروری اہمیت دینے میں افراط سے کام لیا ہے وہاں مولانا مودودی صاحب نے بھی اس مسئلہ کو بہت ہی زیادہ غیر اہم قرار دیکر کچھ کم تفریط سے کام نہیں لیا۔

جہاں کہیں بھی روٹی کمانے اور کسب معاش کا نام آتا ہے وہاں مولانا کے تنفر کی کوئی انتہا نہیں رہتی حالانکہ دراصل مال پیدا کرنے اور اسکی تقسیم کا مسئلہ اس سے بہت زیادہ اہم ہے جتنا کہ مولانا خیال کرتے ہیں۔ جس شخص کے ذہن میں غریب کاشتکاروں، مزدوروں، اور دستکاروں کی فلاکت اور افلاس کی پوری پوری تصویر ہے، جو شخص یہ جانتا ہے کہ یہ سب خدا کے بندے کس طرح مہاجن اور ساہوکار کی اقتصادی غلامی میں گرفتار ہیں، جو شخص اس سے واقف ہے کہ اس جفاکش مخلوق الٰہی کی گاڑھی کمائی کا بڑا حصہ کس طرح انکے قرضخواہوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے، وہ شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ روٹی کا مسئلہ اس قدر مبتذل نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کی توجہ کے قابل نہ ہو[15]۔ اقتصادی غلامی

[15] مجھے اس سخن فہمی پر حیرت ہوتی ہے جس کا اظہار فاضل تنقید نگار نے اپنی تنقید کے اس حصہ میں فرمایا ہے۔ ناظرین براہ کرم "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول (طبع دوم) میں صفحہ ۱۲ تا ۱۴، صفحہ ۱۸، صفحہ ۲۲ تا ۲۳، صفحہ ۴۹ تا ۵۹، اور حصہ دوم میں صفحہ ۸۳ تا ۸۴، صفحہ ۸۵ تا ۸۹، صفحہ ۹۰ تا ۹۳ کو بغور ملاحظہ فرمائیں، اسکے بعد انہیں خود معلوم ہو جائیگا کہ میں نے کیا کہا تھا اور فاضل تنقید نگار نے کیا سمجھا۔ جن باتوں پر اعتراض فرما رہے ہیں وہ میری تحریر میں کہیں موجود نہیں ہیں، بلکہ خود ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں، لہذا ایسے دلائل پر کوئی اظہار خیال کرنا غیر ضروری ہے۔ م

سیاسی غلامی سے کسی طرح کمتر بلا نہیں ہے۔

انچہ شیراں را کند روباہ مزاج

احتیاج است احتیاج است احتیاج

مختلف ملکوں اور مختلف قوموں میں تنازع للبقاء کی جنگ جاری ہے اور ایک قوم دوسری قوم کو ہر ممکن طریقہ سے زک دینا چاہتی ہے۔ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر اقتصادی تفوق حاصل کرے۔ لہذا کسی قوم کو معاشی اور اقتصادی غلامی سے آزاد کرانا اس قوم کی سچی خدمت کرنا ہے اور ہر طرح سے قابل قدر اور قابل عزت ہے۔ جس وقت جس قوم کو جو کمزوری سب سے زیادہ لاحق ہو اس وقت اُس کمزوری کا دور کرنا اس قوم کی سب سے بڑی خدمت ہے۔[1]

مسلمانوں کی اس وقت کی اقتصادی اور معاشی ردی حالت جسکی وجہ سے وہ اغیار کی اقتصادی غلامی میں بڑی حد تک مبتلا ہیں اُنکے نظام قومی کا بہت ہی ہلاکت خیز مرض ہے۔ اس مرض کے اسباب دریافت کرنا، ان کو دفع کرنیکی تدابیر سوچنا، اور اُن تدابیر کو عملی جامہ پہنانا بہت قابل قدر قومی خدمت ہے۔ جو شخص اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے اپنی قوت بازو سے بغیر کسی دوسرے کا مرہون منت ہوئے روزی کماتا ہے وہ بہت ہی قابل قدر ہستی ہے۔ یہ امر بھی واقعہ کے خلاف نہیں ہے کہ تاریخ کے بہت سے انقلابات میں معاشی ظلم کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ معاشی ظلم سے میری مراد اس ظلم سے ہے جسکی وجہ سے ایک کام کرنے والے کو اسکی محنت کا پورا اجر نہ مل سکے۔

ساری دنیا ہے کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو دیگر اقوام کی اقتصادی غلامی سے بچانے کی فکر میں لگی رہتی ہے اور ایسی تدابیر سوچتی ہے اور اُن پر عمل کرتی ہے جنکے ذریعہ سے ان کی قوم کسی دوسری قوم کی دست نگر نہ رہے۔ مگر ہمارے علما اور بزرگوں کا عجب وتیرہ ہے کہ مسلمانوں کو انکی موجودہ نکبت اور فلاکت سے نجات دلانیکی تدابیر سوچنا اور مسلمانوں

[1] اگر نواب صاحب کا خیال یہ ہے کہ روٹی کی آواز بلند کرکے جو حضرات مسلمانوں کو پکار رہے ہیں وہ در اصل اس "خدمت" کو انجام دینا چاہتے ہیں، تو سوائے اسکے کہ میں اس خوش فہمی پر انکو مبارکباد دوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر نواب صاحب بھی میری طرح یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آواز بلند کرکے مسلمانوں کی معاشی خستہ حالی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جارہی ہے، تو میں ادب کے ساتھ عرض کرونگا کہ مجھے مخاطب کرکے جو کچھ فرمایا جارہا ہے وہ بے محل ہے۔ م

کو ان تدابیر پر عمل کرنے کی ترغیب دینا تو درکنار اگر مسلمان روٹی اور کسب معاش کا نام لیتا ہے تو اسکو پیٹ کا کتا کہہ کر اس کی تذلیل کی جاتی ہے۔ معدہ اور معدہ کو پُر کرنے کی فکر کو مولانا مودودی صاحب بہت ہی قابل مذمت تصور فرماتے ہیں۔ معدہ اگرچہ انسان کے جسم کے اعضائے رئیسہ میں سے نہ سہی لیکن اگر معدہ اپنا فعل ٹھیک ٹھیک نہیں کرتا تو جملہ اعضائے رئیسہ بہت جلد معطل اور اپنا صحیح فعل کرنے کی قابلیت کھو بیٹھتے ہیں۔

یہ اسلام اور ہم مسلمانوں کے لیے سخت ذلت اور اہانت کی بات ہے کہ ہم مسلمان یا ہم میں کے اکثر افراد ہندو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے سامنے اپنی اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہمیشہ ہاتھ پھیلائے رہیں۔ یہ کیسی اسلامی غیرت ہے کہ ان سب حالتوں کو دیکھتی ہے اور اسکے سکون اور اطمینان میں ذرا فرق نہیں آتا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جو مسلمان روٹی کمانے کی اور مسلمانوں کو انکی اقتصادی غلامی سے چھڑانے کی کوشش کرتے انکی ان کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھا جاتا نہ یہ کہ ان پر پیٹ اور معدہ کی پھبتیاں کسی جاتیں۔

مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ کے خلاف مولانا نے اپنے مضامین کے پہلے مجموعہ میں بھی قلمی جہاد کیا تھا اور یہ مجموعہ بھی ایسے جہاد سے خالی نہیں ہے اور میں نے اپنے ان مضامین کی پہلی قسط میں بھی مولانا کے جہاد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی اور اب پھر مجبوراً کرتا ہوں۔ مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ مولانا کو ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اگرچہ اس دوسرے مجموعہ میں مغربی تعلیم اور مغربی تعلیم یافتہ گروہ کے خلاف لکھنے کے مواقع کم آئے ہیں مگر موجودہ مجموعہ بھی اس رنگ سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ مجموعہ زیر بحث کے صفحہ ۷ پر مولانا فرماتے ہیں:۔

> "ایک صدی تک خوب پٹنے اور اخلاقی حیثیت سے تباہ ہوجانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ تغیرات زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بن کر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے بعد ہمارے دانشمندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تعلیم دی اور وہ یہ تھی کہ
>
> "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"
>
> ہم نے کہا آؤ اسی کو آزما دیکھیں شاید اپنے آپکو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ

پہلے ہم نے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانہ کی رو کے ساتھ بہنے کے لیے تیار کیا۔“

گویا مولانا کو مسلمانوں کے مغربی تعلیم کی طرف رجوع کرنے میں کوئی خیر کا پہلو سوائے شر کے نظر نہیں آتا۔ جہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان مغربی تعلیم کی طرف اپنے آپ کو زمانہ کی رو کے ساتھ بہانے کے لیے گئے وہاں یہ بھی تو زیادہ معقول وجوہ کی پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان مغربی تعلیم کی طرف اس لیے گئے کہ مغرب نے پچھلی دو تین صدیوں میں، جبکہ ہم مسلمان خواب غفلت میں مبتلا تھے، جو نئے انکشافات کیے تھے، نئی نئی معلومات حاصل کی تھیں، نئی نئی ایجادات کی تھیں، ان معلومات، اُن اسرار اور حکم سے ہم مسلمانوں کو بھی واقفیت حاصل ہو اور ان نئی معلومات کے ذریعہ سے ہم مسلمان بھی اپنے صدیوں کے جمود سے نکل کر سائنٹفک ایجادات اور انکشافات میں کچھ حصہ لینے کے قابل بنیں۔[۱]

اسی صفحہ پر آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:۔

”مغربی تعلیم کے تجربہ سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے محض ایک عنصر یعنی ”تعلیم“ کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جن کے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک

[۱] محض بحث کی خاطر ایسی باتیں کرنے سے کیا حاصل جن کی کمزوری سے خود قائل بھی واقف ہو؟ آج یہ کس سے پوشیدہ ہے کہ انگریزوں نے جو نظام تعلیم ہندوستان میں قائم کیا ہے وہ ہمارے لیے کسی طرح مفید نہیں؟ انہوں نے ہم کو سائنٹفک ایجادات و انکشافات میں حصہ لینے کے قابل بنانے کے لیے یہ نظام تعلیم قائم نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی سلطنت کے خدام فراہم کرنے کے لیے کیا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو خود دیکھ لیجیے کہ ہم میں کلرک کتنے پیدا ہوئے اور سائنٹسٹ کتنے۔ کئی سال سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جو کانووکیشن ایڈریس پڑھے جا رہے ہیں، کاش کہ فاضل مضمون نگار انہی میں سے کسی کو پڑھ لیتے تو اس بحث میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مغربی تعلیم پر ہمارا اعتراض اس حیثیت سے نہیں ہے کہ یہ جدید علمی انکشافات اور ذہنی ترقیات سے ہم کو آشنا کرتی ہے۔ اعتراض دراصل اس حیثیت سے ہے کہ اس تعلیم کے لیے جو نظام سرکار سعادت آثار کی سرپرستی میں یہاں قائم ہوا ہے اس کا کوئی ربط ہماری تہذیب و مدنیت سے نہیں ہے، بلکہ وہ ہماری تہذیب سے بالکل مختلف ایک غلامانہ تہذیب کی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ م

رابطہ ہے، خود بخود اسکے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطہ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت مقرر کرنے کا کچھ دوسرا معیار، متمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز (تعلیم) کو قبول کرتے ہی خوانا و ناخواندہ آنے شروع ہو جاتے ہیں اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نامسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔"

یہاں بھی مولانا کو نئی تعلیم میں صرف ذم ہی کا پہلو نظر آتا ہے اسلئے ان کے نزدیک نئی تعلیم کے ساتھ جو دیگر عناصر مغربی زندگی کے ہم میں سرایت کر جاتے ہیں وہ شر کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے۔ مولانا اور انکے بہت سے ہم خیال علما[18] کے نزدیک مغرب میں سوائے شر کے کوئی خیر کی بات ہے ہی نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مغربی اقوام اپنے اخلاق اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ایک مجموعہ اشرار ہیں اور ان میں کوئی اخلاقی خوبی نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ ہم مشرقی اقوام (جن میں مسلمان بھی شامل ہیں) اخلاقاً اور عملاً مغربی اقوام سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا اور انکے ہم خیال بزرگوں نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ یہ اشرار کا مجموعہ ہم ابرار پر دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک کیونکر مسلط ہو گیا؟[19] کیا دنیا میں شر ہی کی فتح

---

[18] فاضل تنقید نگار اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں "گروہ علماء" میں سے ہوں، اور "مولوی" ہونے کی حیثیت سے جدید تعلیم اور جدید تعلیم یافتہ گروہ پر حملہ کر رہا ہوں۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے گروہ علماء میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصہ پایا ہے اور دونوں کو چاروں کو خوب چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو۔ دونوں کی خامیوں پر میں نے آزادی کے ساتھ تنقید کی ہے، اسلیے کہ میرا کوئی خاص رشتہ کسی گروہ سے نہیں ہے۔ مگر جو لوگ خود کسی ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کا جی چاہتا ہے کہ صرف انکے مخالف گروہ کی برائیاں ہی بیان کی جائیں، اور ان کے اپنے گروہ کے متعلق جب گفتگو کا موقع آئے تو منہ میں گھنگنیاں ڈال لی جائیں، یا اگر کچھ کہا بھی جائے تو صفائی پیش کرنے کے انداز میں۔ م

[19] یہ ایک عجیب بحث ہے، اور اس سے عجیب تر یہ ہے کہ اس بحث کو چھیڑنے کا موقع کتنا بہتر تلاش کیا گیا ہے۔ جس عبارت پر تنقید فرمائی گئی ہے اس میں تو یہ بیان کیا گیا تھا کہ ایک غلام قوم اپنے آقاؤں کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لیے جب تیار ہو جاتی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ لیکن تنقید میں بحث یہ چھیڑ دی گئی کہ آقایان نامدار اشرار ہیں یا ابرار؟ اور اشرار ہیں تو وہ ہم ابرار پر غالب کیسے ہو گئے؟ میں حیران ہوں کہ یہ اشرار و ابرار کی تنقیح اس بحث میں پیدا کیسے ہو گئی۔ م

ہے اور خیر ہمیشہ سرنگوں رہنے کے لیے ہے؟ اگرچہ خداوند عالم کا فرمان تو یہ ہے کہ "اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ"۔

اسلیے لازم آیا کہ مغربی اقوام میں اگر برائیاں ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہیں اور اگر انکی خوبیاں ہماری خوبیوں سے زائد نہیں تو کم از کم کمتر بھی نہیں ہیں۔ اسلیے اگر ہم مغربی تعلیم اور مغرب کے ماحول سے کچھ برائیاں حاصل کرسکتے ہیں تو کچھ خوبیاں بھی سیکھ سکتے ہیں۔ یہ ہماری خود اپنی اہلیت سے ہے کہ ہم خوبیاں سیکھیں یا محض برائیوں ہی میں کمال حاصل کریں۔ ہمارا عمل تو خذ ما صفی ودع ما کدر پر ہونا چاہیے۔ مغربی اقوام سے ہم جفاکشی، خوداعتمادی اور عزم و استقلال کا سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اپنے ذاتی نفع کو اپنے قومی نفع پر قربان کرنا سیکھ سکتے ہیں۔ آزادی رائے اور ذاتی اجتہاد کی نعمت حاصل کرسکتے ہیں۔ آپس میں اتحاد و اتفاق کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب خود مسلمانوں کے بھولے ہوئے سبق ہیں، کبھی یہ سب سبق ہم کو ازبر تھے۔ یہ امر واقعہ بھی نہیں ہے کہ مغربی تعلیم اور مغربی ماحول سے ہم نے برائیاں ہی برائیاں سیکھیں خوبیاں کچھ حاصل نہیں کیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر مثل دیگر مشرقی اقوام کے اگر صدیوں سے جمود طاری تھا (اور اس کا مولانا کو خود اعتراف ہے) اگر اب یہ ٹوٹا یا اس میں کمی آئی، اگر ہم میں بہ نسبت پہلے کے کچھ زیادہ آزادی رائے اور قوت اجتہاد پیدا ہوئی، اگر ہماری توہم پرستی کسی حد تک دور ہوئی، ہم میں جو شخصیت پرستی کی بیماری تھی اگر اس کے استبداد میں کچھ کمی آئی (مولانا مودودی صاحب بھی اسکے قائل ہیں) تو یہ مغربی تعلیم اور مغربی ماحول ہی کا نتیجہ ہے۔ آج کل جو سیاسی شورش سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے اور جس سے مسلمان باوجود اپنے صدیوں کے جمود کے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، یہ بھی مغربی خیالات کی ملک میں نشر و اشاعت ہی کا نتیجہ ہے۔ پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تعلیم اور مغربی ماحول محض شر ہی شر ہے اس میں خیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے؟ اگر مغربی تعلیم کا سیاہ رخ ہم کو دکھلا کر ہم کو مغربی تعلیم سے روکا جاتا ہے تو ہم کو یہ بتایا جائے کہ ہم کو کس تعلیم کی طرف بلایا جاتا ہے؟ اُسی تعلیم کی طرف نا جس کی وجہ سے صدیوں سے ہم پر جمود کی حالت طاری تھی[20]؟ مولانا کو خود تسلیم ہے کہ صدیوں سے ہم پر جمود طاری تھا (دیکھو

[20] جی نہیں۔ اس تعلیم کی طرف جس میں جمود کے بجائے حرکت اور غلامی کے بجائے آزادی ہو۔ اگر کوئی شخص غلامی کے لیے تیار کرنے والی اور غلامانہ اطوار پیدا کرنے والی تعلیم کی مخالفت کرے تو اس سے یہ کس طرح لازم آجاتا ہے کہ اسے پرانے جامد طرز تعلیم کا حامی سمجھ لیا جائے؟ کیا بس یہی دو راستے آپکے نقشہ میں آتے ہیں، اور تیسرے کسی راستہ کا آپ تصور نہیں کرسکتے؟ حیرت یہ ہے کہ نواب صاحب مجھ سے یہ سوال کر رہے ہیں حالانکہ میں تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر اپنے خیالات جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ ۵۴ھ کے ترجمان القرآن میں پیش کر چکا ہوں اور خود نواب صاحب ان مضامین کو ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ م

مقدمہ صفحہ ۹ سطر ۱۴) اس جمود کی اصلی وجہ اگر ہمارا وہ مروجہ طریقہ تعلیم نہ تھا تو کیا تھا جو ہم کو جملہ ایسے علوم سے جن کا تعلق تجربہ اور مشاہدہ سے ہو قریب قریب معترا رکھتا تھا اور جس کے تحت عمومی تعلیم اور تعلیم نسواں کا کوئی انتظام نہ کر کے مسلمان آبادی کے بہت بڑے حصہ کو علم کی دولت سے یکسر محروم رکھا گیا تھا؟ ہم ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت جس قدر نقائص کمزوریاں اور خرابیاں ہیں اسکا ذمہ دار ایک غیر مسلم قوم کے غلبہ اور استیلاء کو قرار دیدیا جاتا ہے اور اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کے بڑی حد تک ہم خود اور ہمارا مروجہ طریقہ تعلیم ذمہ دار ہے " اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ " اگر ہندوستان میں ہم مسلمانوں کی معاشی اور دیگر کمزوریوں کا ذمہ دار ایک غیر مسلم قوم کا غلبہ اور استیلاء ہوتا تو ظاہر ہے کہ دیگر اسلامی ممالک میں مثل افغانستان، ایران، ٹرکی، اور عرب کے مسلمانوں کی حالت ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہوتی ۔ مگر کیا ایسا ہے؟ جو جمود کی حالت اب سے پچاس برس پہلے ہم ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری تھی وہی حالت قریب قریب سارے عالم اسلام پر طاری تھی اور سارے عالم اسلامی کی یہ ردی حالت ایک ہی سبب کا نتیجہ تھی یعنی فقدان عمل، بیجا تقلید اور غلط طریقہ تعلیم ۔

اس بحث میں کلام کو کسی قدر طول ہو گیا مگر اس بحث میں اس قدر تفصیل کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ میرا یہ خیال ہے کہ مغربی تعلیم، مغرب کی ایجادات اور انکشافات اور مغرب کی ہر چیز کی طرف سے خواہ وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو مسلمانوں میں بیجا تعصب اور اجتناب پیدا کرنا مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہے ۔ اس بیجا تعصب کی ایک چھوٹی سی مثال میں ذیل میں درج کرتا ہوں ۔

ناظرین کرام نے کچھ عرصہ ہوا اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہوگی کہ لکھنؤ کے ایک اسلامی عربی مدرسہ کے طلبا نے اسٹرائک کر دی اور وہ مدت تک جاری رہی ۔ یہ حضرات شیعہ کا مدرسہ ہے ۔ اسٹرائک کی وجہ یہ تھی کہ طلبا کو انگریزی مدارس کی دیکھا دیکھی اس بات پر اصرار تھا کہ انکو فٹ بال کھیلنے کی اجازت دیجائے اور مدرسین و منتظمین مدرسہ محض اس وجہ سے کہ فٹ بال ایک مغرب سے آیا ہوا کھیل ہے ایسی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ اسی طرح ایک مولانا صاحب سے جو مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے پڑھے ہوئے ہیں معلوم ہوا کہ جب وہ مدرسہ مذکور میں طالب علم تھے اس وقت وہ اور کچھ اور اس مدرسہ کے طلبا چھپ چھپ کے

ایک میدان میں فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ جب مدرسہ کے مدرس اعلیٰ کو اسکی اطلاع ہوئی تو ایک مدرس صاحب اس کام پر مقرر کیے گئے کہ اس معاملہ کی تحقیقات کریں کہ آیا یہ بدعت طلباء میں جاری ہوگئی ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ بزرگ جانچ کرنیکے لیے اس میدان میں گئے۔ مگر لڑکوں نے اپنے مخبر تعینات کر رکھے تھے اسلیے مولانا کے میدان میں پہونچنے سے پیشتر لڑکے منتشر ہوچکے تھے۔

اسی قسم کا بیجا تعصب ہے جس سے مسلمانوں کو زمانہ گذشتہ میں بھی نقصان پہونچا اور اب بھی پہونچ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ علماء خود تندرستی اور طلباء کی جسمانی حالت درست کرنیکا کوئی انتظام عربی مدارس میں کرتے، ایک کھیل کو جو لڑکوں میں پھرتی، چستی اور دوڑ دھوپ کی عادت پیدا کرتا ہے محض اسوجہ سے مردود قرار دیدیا کہ وہ مغرب سے آیا ہوا ہے نہایت بیجا ہے اور صریحاً اس حدیث نبوی کے خلاف ہے کہ اطلبوا الحکمۃ ولو کان بالصین۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی تعلیم جس ماحول میں دیجاتی ہے اس سے ہمارے عقائد پر بُرا اثر ضرور پڑتا ہے۔ اسی لیے تو اس سے پہلے بھی عرض کیا گیا اور اب بھی عرض کیا جاتا ہے کہ عربی مدارس خود اپنے نصاب میں علوم جدیدہ کی تعلیم کو داخل کریں تاکہ علوم جدیدہ کی تعلیم ایسے ماحول میں دیجائے جو موجودہ مغربی تعلیم کے مضر اثرات سے پاک ہو۔ مغربی تعلیم کے جو اسلامی ادارے ہیں ان میں دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اگر یہ انتظام ناقص ہے تو اسکی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ ان مقاصد کے حصول کا ایک آسان ذریعہ یہ ہوسکتا ہے کہ عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلباء میں سے ایک متعین تعداد ایک متعین مدت کے لیے مغربی تعلیم کے مسلم اداروں (مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) میں علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجی جائے۔ اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ عربی مدارس میں علوم جدیدہ کی تعلیم کی خدمت انجام دیں اور نیز مغربی تعلیم کے اسلامی اداروں کے لیے انہیں لوگوں میں سے مذہبی تعلیم کے لیے استادوں کا انتخاب کیا جائے۔ یہ تجویز کوئی ایسی ناقابل عمل تجویز نہیں ہے کہ اگر عربی مدارس کے ارباب حل وعقد اور مغربی تعلیم کے اسلامی اداروں کے منتظمین ایک جگہ جمع ہوکر اس کو عمل کا جامہ پہنانا چاہیں تو یہ عملی صورت اختیار نہ کرسکے۔ لیکن اگر ایک طرف مغربی تعلیم کے حامی اور دوسری طرف پُرانی تعلیم کے دلدادہ زعم باطل لیے بیٹھے رہیں کہ اپنی اپنی جگہ تعلیمی معاملات میں ہر ایک کا طریقہ کامل واکمل ہے اور ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے اور اس میں کسی ترمیم اور

اصلاح کی گنجائش نہیں ہے تو نہ تو مغربی تعلیم میں جو نقائص ہیں وہ دور ہو سکتے ہیں اور نہ پرانی تعلیم میں جو کمی اور خامی ہے وہ رفع ہو سکتی ہے۔

مسلم لیگ کے بارے میں توضیح مسلک کی ضرورت | خیر یہ توضمنی بحثیں تھیں - اب میں پھر اصلی بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ مولانا نے اپنے مضامین میں کانگریس کی شرکت کے خطرات کو پورے طور پر واضح کر دیا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق سوائے اسکے کہ اسکو ضمناً ایک چھوٹی بلا قرار دیا ہے[۲۱] ابھی تک کوئی صاف اظہار خیال نہیں فرمایا ہے - انکے مؤید اور ہم خیال مولانا منظور صاحب نعمانی نے البتہ اپنے سلسلۂ مضامین میں مسلم لیگ اور افراد مسلم لیگ پر کھلے کھلے حملے کئے ہیں[۲۲] جنکا کافی وشافی اور مسکت جواب میں اپنے ان مضامین کی دوسری قسط میں دے چکا ہوں اور جسکے مسکت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ باوجود میرے اصرار کے مولانا منظور صاحب نے میرے اس مضمون کو اپنے رسالہ "الفرقان" میں بالکلیہ شائع کرنے سے گریز فرمایا۔ مولانا مودودی صاحب نے چونکہ اب تک ان وجوہ سے جنکی بنا پر موصوف کو مسلم لیگ سے اختلاف ہے بحث ہی نہیں کی اس لیے مولانا موصوف کے رفع شکوک کے لیے کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس وقت سیاسی میدان میں کام کرنے والی سب سے بڑی اور سب سے وقیع مسلمانوں کی اگر کوئی منظم جماعت ہے، تو وہ مسلم لیگ ہے۔ وہ جماعت جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے، وہ جماعت جو سب سے زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور بجا طور پر کر سکتی ہے، وہ جماعت جسکے لیے لبیک کی صدا اسوقت ہر حصہ ملک سے اٹھ رہی ہے۔ اگر اس وقت کانگریس کی کسی حد تک کوئی جماعت مدمقابل کہی جا سکتی ہے تو وہ مسلم لیگ ہی ہے۔ یہاں تک کہ ان صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں مسلم لیگ کے نمائندوں نے اکثر مواقع پر کانگریس کے نمائندوں کو انتخاب کے وقت شکستیں دی ہیں۔ کانگریس کو خود اس کا اعتراف ہے کیونکہ پچھلے سال جب کانگریس نے مسلمانوں سے مفاہمت کرنا چاہی تو مسلم لیگ ہی کو اپنا مخاطب بنایا۔ جب یہ صورت ہے تو کیا ہر مسلمان کا یہ فرض نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اس واحد

[۲۱] کانگریس کے مقابلہ میں نہیں بلکہ مسلمانوں کی اُن جماعتوں کے مقابلہ میں جو اس مرحلہ پر کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کر رہی ہیں - م

[۲۲] بلاشبہ مولانا میرے ہم خیال ہیں، مگر کیا اپنے ہم خیالوں کی ہر بات کا جوابدہ مجھے ٹھیرایا جائیگا؟ - م

منظم جماعت کو قوی سے قوی تر بنائے تاکہ سیاسی میدان میں اس جماعت کی آواز وقیع سے وقیع تر ہو؟ برخلاف اس کے کیا یہ مسلمانوں کی کھلی ہوئی بدخواہی نہ ہوگی کہ مسلمانوں کی اس واحد منظم جماعت کی مخالفت کرکے اسکی ہوا خیزی کی جائے؟ مولانا مودودی صاحب اور ان جیسے دیگر اہل قلم اپنی تحریر اپنی تقریر اپنے زور قلم اور اپنی بے مثل قابلیت کے ذریعہ سے مسلم لیگ کو بہت کچھ قوت پہونچا سکتے ہیں۔ کیا یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں ہے کہ مولانا مودودی صاحب جیسے بزرگوں کا سب زور قلم مسلمانوں کی واحد منظم جماعت کو ایک بلا ثابت کرنے میں صرف ہو؟ اگر مسلمانوں کی سات آٹھ کروڑ آبادی مسلم لیگ کی پوری پوری تائید پر آمادہ ہو جائے تو مسلم لیگ کی آواز کو بھی اس سیاسی کشمکش کے زمانہ میں وہی وقعت حاصل ہو جائے جو کانگریس کو حاصل ہے اور پھر اس ہندوستان میں کوئی سیاسی گروہ ایسا نہیں ہو سکتا جو مسلم لیگ کی آواز پوری توجہ کے ساتھ نہ سُنے۔ مسلم لیگ اسکی مدعی نہیں ہے کہ اس میں نقائص اور خامیاں نہیں ہیں اور اب وہ فوق الاصلاح ہے۔ لہذا جن بزرگوں کو مسلم لیگ کے نقائص اور خامیوں کا احساس ہے ان کے لیے بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ مسلم لیگ میں شرکت فرما کر اپنے اثر سے اس کی اصلاح کریں۔ مگر اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کو اس سے مایوسی ہے کہ ہم مسلم لیگ میں شرکت کر کے اسکی اصلاح کر سکیں گے۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی[۲۲]۔ اگر آپ کانگریس اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر اپنی کوئی الگ سیاسی

[۲۲] میرے نزدیک مسلم لیگ کی اصلی بدخواہی یہ ہے کہ جو لوگ علیحدہ رہ کر خاموشی کے ساتھ بالواسطہ طریقوں سے اسکے نقائص اور اسکی خامیوں کی اصلاح کے لیے کوشش کر رہے ہیں ان کو چھیڑ چھیڑ کر مجبور کیا جائے کہ اسکی خامیوں کو واشگاف بیان کریں۔ فاضل مضمون نگار شاید یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کے لیے کسی جماعت کے بارے میں دو ہی مسلک ممکن ہیں۔ یا تو وہ اس کا حامی و مؤید بن جائے اور ہر سیاہ و سپید میں اسکی تائید کرے۔ یا نہیں تو اس سے لڑنے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے اور اسکے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت کھڑی کر دے۔ لیکن میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان دو راستوں کے سوا ایک تیسرا راستہ بھی ہے جسے سلامتی پسند لوگ اختیار کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جب آپ جماعت میں ایسے نقائص پائیں جنکی موجودگی میں اس کے ساتھ وابستہ ہو جانا آپکے ضمیر کے خلاف ہو تو اس سے علیحدہ رہ کر فتنہ پیدا کیے بغیر اصلاح کی کوشش کیجیے۔ آپ جماعت میں شریک ہونگے تو آپ کو یا تو اصولی خرابیوں پر سکوت اختیار کرنا پڑیگا، یا اندر رہ کر لڑنا ہوگا۔ پہلی صورت کو کوئی ایمان دار آدمی پسند نہیں کر سکتا۔ رہی دوسری صورت تو جب کہ لڑائی سے اصلاح کی توقع کم اور فتنہ کا خطرہ زیادہ ہو تو اس سے بھی اجتناب واجب ہے۔ لہذا سلامتی کا طریقہ یہی ہے کہ جن خرابیوں کی اصلاح مقصود ہو ان پر خیرخواہانہ تنقید کی جائے، اور عامۃ الناس میں اپنے خیالات کثرت کے ساتھ پھیلائے جائیں تا آنکہ ایک معتد بہ جماعت ان خیالات کی حامل ہو جائے اور بغیر کسی فتنہ کے وہ اصلاح ہو جائے جو مقصود ہے۔ م

جماعت بنانا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کا منتہائے نظر یہ ہوگا کہ آپ کل مسلمانوں کو یا کم از کم انکی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو کون سی وجہ ہے کہ مسلم لیگ میں شرکت کرکے اسکے نقائص کے دور کرنے کی طرف سے آپکو مایوسی ہو؟ کیا کوئی معقول وجہ یہ باور کرنے کی ہو سکتی ہے کہ مسلم لیگ سے الگ رہ کر تو آپ مسلم لیگ کی اصلاح کر سکتے ہیں مگر اس میں شرکت کرکے ایسا نہیں کر سکتے؟ بہر حال حالات موجودہ میں مسلمانوں کی کوئی نئی پارٹی کھڑی کرنا مسلمانوں میں ایک نیا اختلاف اور افتراق پیدا کرنا ہے اور ایسا عمل مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو بجائے نفع کے سخت نقصان پہنچانے والا ہے۔ اسلیے کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب اور انکے ہم خیال بزرگ آیندہ سے بجائے مسلمانوں کی ایک علحدہ سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈالنے کے اپنی ساری قوت استدلال اور اپنا سارا زور قلم مسلم لیگ کی حمایت اور مسلم لیگ کو قوی سے قوی تر بنانے میں صرف کرینگے؟ وما علینا الا البلاغ۔

مطبوعات

بنی اسرائیل کا چاند تالیف رائڈر ہیگرڈ، مترجمہ عبد المجید صاحب حیرت بی۔ اے علیگ، ضخامت ۷۴۴ صفحات، قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

یہ ایک مشہور تاریخی ناول ہے، جس میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے اور فرعون کے غرق ہونے کی مصوری نہایت پر تاثیر انداز میں کی گئی ہے۔ اصل مصنف ایک غیر مسلم ہے اس لیے اس سے یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ وہ تاریخی حقائق کے اظہار میں اسلامی روایات و نصوص کا پابند ہوگا۔ مترجم نے ترجمہ میں سلاست اور محاورہ کا پورا خیال رکھا ہے۔ لیکن بعض املا کی غلطیاں مسلسل دہرائی گئی ہیں مثلاً غیظ و غضب کو ہر جگہ غیض و غضب لکھا ہے۔ شاید یہ کاتب کا سہو قلم ہوگا۔ بہر حال اس قسم کے نقائص سے دوسرے ایڈیشن میں کتاب کو پاک کرنا ضروری ہے۔

بیوہ مصنفہ منشی پریم چند آنجہانی۔ ضخامت ۱۹۷ صفحات، قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی

یہ بھی ایک معاشرتی ناول ہے جو ہندوؤں میں بدھوا بواہ (نکاح بیوگان) کی ضرورت پر لکھا گیا ہے۔ مصنف ہندوستانی معاشرت خصوصاً ہندو سوسائٹی کی کمزوریوں کے بہت بڑے نبض شناس تھے اور انھیں کی اصلاح میں انہوں نے اپنی عمر ختم کر دی۔ ہندو سوسائٹی کی اس قبیح رسم پر کہ بیوہ کا نکاح ناجائز ہے جس دردانگیز انداز سے انھوں نے فطری اور نفسیاتی حقائق کی روشنی ڈالی ہے، اسے پڑھ کر انسان کا دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ زبان کی سلاست اور بیان کی دلکشی تو گویا پریم چند کا ساتھ چھوڑنا جانتی ہی نہ تھی۔ اگر ہمارے اہل سیاست واقعی ایک مشترکہ زبان "ہندوستانی" کے رواج کے خواہشمند ہیں تو شائد پریم چند سے بہتر معیار انھیں دستیاب نہیں ہو سکتا جسے ہر ہندوستانی بلاتکلف سمجھ سکتا ہے۔

فن تفسیر | تالیف مرزا عزیز فیضانی صاحب داماپوری - ضخامت ۲۰۰ صفحات ، قیمت ۱۲ ار

ملنے کا پتہ :- مرزا محبوب عالم صاحب ، بشیر بلڈنگ ، بیرون موچی دروازہ - لاہور

یہ کتاب فن تفسیر پر ایک مختصر لیکن مفید تالیف ہے جس کے دو حصے کیے جا سکتے ہیں - پہلے حصے میں فن تفسیر پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈال کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیگر ملتوں نے اپنی آسمانی کتابوں کی توضیح و تفسیر میں کس قدر بے اعتنائی اور سہل انگاری سے کام لیا ہے اور ان کے بالمقابل اہل اسلام نے قرآن کی تفسیر میں کس اہتمام اور کاوش کا مظاہرہ کیا ہے اور کن قدرتی وجوہ کی بنا پر - پھر دور آخر میں مسلمانوں نے بھی اس مقصدِ عظیم سے کیوں غفلت برتنی شروع کر دی - دوسرے حصہ میں اصول تفسیر پر بحث کر کے بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تفسیر کرنے کے لیے کن باتوں کا لحاظ کرنا اور کن باتوں سے دماغ کو آزاد رکھنا ضروری ہے -

جیسا کہ مصنف کو خود اعتراف ہے یہ کتاب فن تفسیر پر محض ایک مقدمہ یا تبصرہ کی حیثیت رکھتی ہے جس میں گو تعرض تمام اہم متعلقہ مباحث سے کیا گیا ہے مگر اس تفصیل اور متین جامعیت کا فقدان ہے جس کی ان مباحث کی اہمیت متقاضی ہے - تاہم کتاب کا افادی پہلو قابل اطمینان اور ان لوگوں کے لیے نفع بخش ہے جو اس علم سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر اس کے اصلی مآخذ سے براہِ راست استفادہ نہیں کر سکتے - کتاب کا نقطۂ نظر مجموعی حیثیت سے نہایت درست اور احتیاط پر مبنی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات یہ احتیاط کوشی قدامت پرستی کا رنگ اختیار کر گئی ہے - بعض الفاظ آیات کا املا غلط چھپ گیا ہے - ایک جگہ "قاتلوا" کا ترجمہ "قتل کرو" کیا گیا ہے حالانکہ "جنگ کرو" کرنا چاہیے - لفظ سنت اور حدیث کو گو عام لوگ ایک معنی میں بولا کرتے ہیں مگر درحقیقت دونوں میں فرق ہے - اہل علم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیے -

اسلامی معاشرت | تالیف چودھری غلام احمد صاحب پرویز - ضخامت ۶۰ صفحات - ۴ر کے ٹکٹ ارسال کرنے پر دفتر طلوع اسلام ، بلیماران دہلی سے مل سکتا ہے -

یہ ایک اجمالی خاکہ ہے اسلامی آداب اخلاق و معاشرت کا جسے قرآن پاک کی آیات سے مرتب کیا گیا ہے

احکام قرآنی کے اصل الفاظ (آیات) مع ترجمہ پیش کر دیے گئے ہیں اور کہیں کہیں تشریحی بیان شامل کر دیا گیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ اسلام نے کس چیز سے روکا ہے، کس بات کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، مسلمان کو اپنی انفرادی، اجتماعی، خانگی اور پبلک زندگی میں کس لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یہ رسالہ اختصار کے باوجود اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ انداز بیان صاف اور شگفتہ ہے، اور اسلامی صورت وسیرت کا بہترین آئینہ۔

"غیر مسلموں کے بزرگوں کی تعظیم کرو" کے زیر عنوان دیگر پیشوایان مذاہب کے بارے میں گو موئف نے کافی احتیاط سے کام لیا ہے تاہم اس احتیاط کے اندر سے بھی بوئے مداہنت آتی ہے۔ محض کسی گروہ کا اپنے پیشوا کے متعلق یہ دعویٰ کر دینا کہ وہ "ایشور کا بھگت اور خدا کا رسول تھا" ہم پر یہ لازم نہیں کر دیتا کہ ہم اس کے نبی ہونے کے امکان کو مرجح قرار دیدیں اور اگر مع ان کی تعلیم یا ان کے حالات قرآن کریم کے معیار پر درست ثابت نہ ہوں تو یہ سمجھ لینا پڑیگا کہ بعد میں آنے والوں نے ان میں رنگ آمیزی کر دی ہے۔ اس اصول کے مطابق مرزا صاحب قادیانی اور گرونانک صاحب کے متعلق کیا تخیل قائم کیا جائیگا؟ کیونکہ ان کے پیرو انھیں فرستادگان الٰہی مانتے ہیں اور رسول عربی کا ارشاد ہے کہ لا نبی بعدی۔ علاوہ ازیں جو بانیان مذاہب قبل نزول قرآن گذر چکے ہیں انھیں کے متعلق کیونکر یہ کلیہ قائم کر لیا جائے کہ اگر ان کی تعلیمات اور ان کے احوال قرآنی معیار پر ٹھیک نہ اتریں تو تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کے پیرووں نے رنگ آمیزی کر دی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعی ان کے احوال اور ان کی تعلیمات قرآنی نقطہ نظر کے خلاف رہی ہوں؟ کیا جھوٹا دعویٰ نبوت پچھلے زمانوں میں کوئی ناممکن چیز رہی ہے جبکہ فرعون اور نمرود کے خدا ہونے تک کے دعاوی قرآن میں منقول ہیں؟ ہاں غیر اقوام و ملل کے پیشواؤں کو تعظیمی انداز سے یاد کرنا اور ان کی شان میں گستاخی سے اجتناب کرنا البتہ عین اخلاق ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ پیشوایان مذاہب تو بڑی چیز ہیں قرآن تو بتوں اور پتھر کی بے جان مورتیوں تک کو برے کلمات سے یاد کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

منتخب قرآن | تالیف مولانا احمد علی صاحب - مقامی حضرات دفتر انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ۔ لاہور

سے مفت اور بیرونی حضرات پانچ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

مولانا نے اس چھوٹے سے رسالہ میں زیادہ تر یہ دکھایا ہے کہ قرآن کی تعلیم ارتقائے تمدن اور دیگر دنیوی ترقیوں کی مخالف نہیں بلکہ معاون ہے۔ اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے عروج و اقبال کا راز اسی قرآن کے اتباع ہی میں مضمر ہے اس سلسلہ میں مؤلف نے تاریخی اور جغرافی دلائل تفصیل سے نقل کیے ہیں حتیٰ کہ بعض جگہ اصل عنوان (مقصد قرآن) کی مناسبت کا لحاظ بھی ترک ہو گیا ہے۔ آخر میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے قرآن سے ایک پروگرام تیار کیا ہے۔ عام مسلمانوں کو ان ارشادات سے بیش از بیش مستفید ہونا چاہیے۔

دلی کا سنبھالا | تالیف خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی۔ ضخامت ۵۵ صفحات، قیمت عہ ر ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ دہلی۔

یہ دہلی مرحوم کے سنبھالے کا افسانہ ہے اور دلی کی قدیم ٹکسالی زبان میں۔ مرنے سے ذرا پہلے اس مادر علم و تمدن کے چہرہ پر جو زندگی کی ایک ہلکی سی رو دوڑ گئی تھی اس کی عکاسی مولف کے قلم نے نہایت باکمال طریقہ سے کی ہے جسے پڑھ کر اس وقت کی علمی، تمدنی اور عام معاشرتی حالات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور پڑھنے والے پر عبرت اور حسرت کی ایک بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے۔

دلی کی دو سو برس کی تاریخ | یہ ایک تاریخی مقالہ ہے جس میں مولوی سید حسن برنی صاحب ایم۔ اے نے تیمور کے حملہ سے پیشتر دلی کی دو سو برس کی ابتدائی تاریخ پر اجمالی لیکن محققانہ بحث کی ہے۔ بحث کا رخ زیادہ تر اس دور کی مشہور عمارتوں اور ان کے آثار کی طرف ہے۔ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود اپنے اندر مفید معلومات رکھتا ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

گلشن فانی | نتیجۂ فکر ڈاکٹر شیخ حبیب الدین احمد صاحب فانی لدھیانوی مقیم دہلی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت ۸ ر ملنے کا پتہ :۔ صاف طور سے درج نہیں۔

یہ فانی صاحب کا دیوان ہے جس میں زیادہ تر عشقیہ غزلیں ہیں۔ حمد، نعت اور سلام سے متعلق بھی کافی نظمیں

لکھی گئیں ہیں۔ جہاں تک کتاب کے جستہ جستہ مقامات دیکھنے میں آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر پنجابی ہونے کے باوجود اردو زبان اور روزمرہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہے نعت میں بھی وہی عام عشقیہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جو ہمارے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ حضرت علیؓ کی شان میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں غلو سے کام لیا گیا ہے بلکہ تشیع کا رنگ جھلکنے لگا ہے۔

بیاض سخن | مولفہ جناب عبدالشکور صاحب شیدا، ضخامت ۲۲۴ صفحات، قیمت عہ۔ محمد نسیم محمد صاحب صدیقی نائب محاسب عدالت العالیہ حیدرآباد دکن سے طلب کیجیے

مختلف شعراء کے انتخابی کلام کی بیاض رکھنا ایک مفید اور کارآمد رسم ہے جس کے صدقے بہت سے شعراء کا نام اور کلام مٹنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی ذوق ادبی کا نتیجہ ہے جس میں مولف نے ۲۴۰ شعراء کے ۲۷۹۲ منتخب اشعار جمع کیے ہیں۔ ان شعراء میں موجدین، متاخرین، متقدمین، متوسطین، یورپین، ان پڑھ اور خواتین بھی داخل ہیں اور الگ الگ عنوانات کے ماتحت بالترتیب مع مختصر حالات کے ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ گو کتاب فنی حیثیت سے اصلاح کی محتاج ہے تاہم ادب اردو کی ایک قابل قدر خدمت ہے۔

نغمۂ سروش | نتیجۂ فکر جناب فضل الدین صاحب فدا، ضخامت ۴۰ صفحات، چھوٹی تقطیع قیمت ۶ر۔

ملنے کا پتہ: منیجر "کہکشاں" ۲۲۵۳ گلی شاہ تارا دہلی

یہ فدا صاحب کی ۷۰ رباعیوں کا مجموعہ ہے جسے کاظم صاحب مدیر کہکشاں نے مرتب فرمایا ہے۔ رباعیات کیا ہیں قوم کے مختلف طبقوں کے نام ادب و بیداری کا پیغام ہیں نوجوان شاعر کا جوش طبع قومی درد سے ہم آہنگ ہو کر عجیب و دلکش صورت اختیار کر گیا ہے۔ کلام بحیثیت مجموعی ادب اور بلاغت و لطافت کا بہترین نمونہ ہے۔ فدا صاحب کی عقیدت کیشیِ اسلام کے پیش نظر کاش ان کی زبان سے ع

مرنا ہے تو مرا اپنے وطن کی خاطر

کا مصرعہ نہ نکلتا۔

مثنوی معاش و معاد | نتیجۂ فکر تمنا عمادی مجیبی صاحب، ضخامت سو صفحے، قیمت ۶ر، ملنے کا پتہ: مکتبہ دار الادب

پھلواری شریف۔ (ضلع پٹنہ)

ابھی کل تک فارسی زبان ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی، مدتوں سلطنت انگلشیہ کی بھی سرکاری زبان رہی لیکن گذشتہ صدی کے وسط سے ہندوستان اس سے بیگانہ ہونا شروع ہوا اور اب حال یہ ہے کہ فارسی کا نام ونشان اس خاک سے مٹتا جارہا ہے۔ تمنا صاحب ان گنتی کے شعراء میں سے ہیں جو ابھی قند پارسی کی حلاوت سے اپنے کام ودہن کو بے کیف بنانا نہیں چاہتے، قومی حیثیت سے انکی روش نہایت مستحسن ہے۔ پیش نظر مثنوی بھی اسی فارسی نوازی کا ثمرہ ہے جس میں انھوں نے اسلام اور اخلاق کے بڑے بڑے مسائل کو نہایت سلجھی ہوئی زبان اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، بعض مقامات پر قرآن کی وہ آیات بھی درج کردی ہیں جن کے مطالب کو نظم میں ادا کیا ہے اور جہاں کہیں بظاہر عقلی اعتراضات وارد ہوتے معلوم ہوئے ہیں ان کا ازالہ بھی نہایت مضبوط اور وزنی دلائل عقلیہ سے کیا ہے۔ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

ضرب الامثال | تالیف خواجہ محمد عبدالمجید صاحب دہلوی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی

اردو روزمرہ میں بہت سی کہاوتیں رائج ہیں، جنھیں زبان کی لطافت میں ایک خاص دخل ہے، ان کا استعمال تو لوگ اکثر اپنی تحریر وتقریر میں کیا کرتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کی حقیقی روح سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عموماً ہر مثل قصہ طلب ہوتی ہے، اس لیے ان کا اصل مفہوم اور صحیح محل استعمال اسی وقت معلوم ہوسکتا ہے جب واقعہ متعلقہ کی تفصیلات سے پوری پوری آگہی ہو۔ اردو زبان میں اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اندریں حالات مؤلف کی یہ سعی نہایت مبارک اور شکریہ کے قابل ہے جو انھوں نے اس رسالہ کے مرتب کرنے میں کی ہے۔ تمام امثال کا احاطہ تو مشکل ہے تاہم انھوں نے اپنی وسعت معلومات کے مطابق اکثر مثلوں کو اکٹھا کردیا ہے اور ان سے متعلق جو حکایتیں ہیں ان کی پوری تفصیل مہیا کردی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کون مثل کہاں سے چلی اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ اور مفید ہے۔

معین المنطق (حصہ دوم) | تالیف جناب مولانا مفتی محمود حسن صاحب۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مولانا مفتی

محمود حسن صاحب مدرس اول - جامعہ حسینیہ، راندیر (سورت)

مؤلف نے منطق کے خشک اور دشوار فن کو مبتدی طلبہ کے لیے آسان فہم بنانے کے لیے اردو میں تالیفات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس میں جدید طرز پر اس فن کی ترتیب و تفہیم کی گئی ہے - اس سلسلہ کے حصہ پر پہلے ہم اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں - اس وقت ہمارے سامنے اس کا دوسرا حصہ ہے، جو انہیں خصوصیات کا حامل ہے جو اس کے پہلے حصہ میں تھیں - طرز بیان عام فہم اور سلجھا ہوا ہے - اگر ہمارے مدارس یونانی منطق پر جما رہنا ضروری سمجھتے ہیں تو کم از کم یہی کریں کہ قال اقول، صغریٰ، کبریٰ، مرقات، تہذیب، شرح تہذیب وغیرہ کے مسلسل چکر سے بچوں کو نجات دلا کر انہیں اپنی مادری زبان میں منطق کی تعلیم دیں اور اس طرح ان کے دماغی قویٰ اور ان کے عزیز اوقات کو اتنی فراخ حوصلگی کے ساتھ برباد کرنے سے ایک حد تک بچالیں - اگر وہ اس اصلاح پر آمادہ ہوں تو یہ کتاب اور اس کے دوسرے حصے اس سلسلہ میں انکی بہت کچھ امداد کر سکتے ہیں -

کلام عربی حصہ اول و دوم | تالیف قاضی زین العابدین سجاد صاحب میرٹھی - ضخامت علی الترتیب ۱۰۴ و ۱۱۲ صفحات قیمت ہر ایک حصہ کی ۱۲ر - ملنے کا پتہ :- مکتبہ علیہ میرٹھ -

یہ دونوں کتابیں عربی کے مبتدی طلبہ کے لیے لکھی گئی ہیں - پہلے حصہ میں نحوی ترتیب کے لحاظ سے طلبہ کو قواعد اور معمولی ترجمہ کی مشق کرائی گئی ہے مثالیں زیادہ تر قرآن سے دی گئی ہیں - دوسرے میں ترجمہ، انشا، خطوط کتابت کے طریقے اور دیگر ضروری ادبی مسائل کی عملی تعلیم دی گئی ہے - عربی رسائل و جرائد کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں تاکہ طلبہ جدید عربی سے بھی مانوس ہوتے جائیں - پہلے حصے کے آخر میں ڈیڑھ ہزار کثیر الاستعمال عربی الفاظ اور دوسرے کے آخر میں ساڑھے تیرہ سو جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری بھی شامل کر دی گئی ہے - عربی کے مبتدیوں کے لیے یہ کتابیں بہت مفید ہیں -

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں رُوحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصُول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصُول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حصّہ ہے۔

۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دُوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد صہ غیر مجلد للعہ

رسالہ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عمُوماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصُولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سوہن لال و تصاویر برقی پریس، لاہور میں طبع ہوئے

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ، جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں

ایک روپے میں ۵ نسخے — علاوہ محصول ڈاک

نو روپے میں ۵۰ نسخے
پندرہ روپے میں ۱۰۰ نسخے
} کرایہ ریل بذمہ خریدار

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اس وقت تک ملک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصول اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:-

۲ روپے ۴ آنہ میں . . . . ۵ نسخے
محصول ڈاک بذمہ خریدار

۱۱ روپے ۸ آنہ میں ۲۵ نسخے
۲۲ روپے میں ۵۰ نسخے
۴۰ روپے میں ۱۰۰ نسخے
} کرایہ ریل بذمہ خریدار

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے